پوشکن

شعر و شاعری

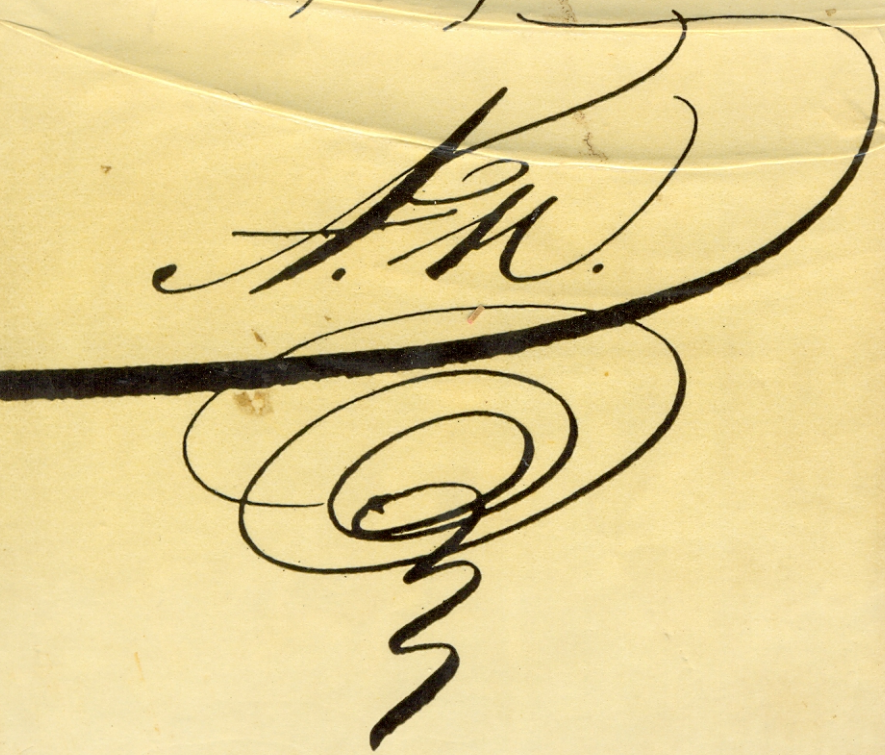

منظوم ترجمہ ظ انصاری

۹۱۸۱

نسیم شہریار
تیسرے سال ۔ ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس
ایل ۔ ایم ۔ سی
جامشورو

۱۲-۲-۸۴

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

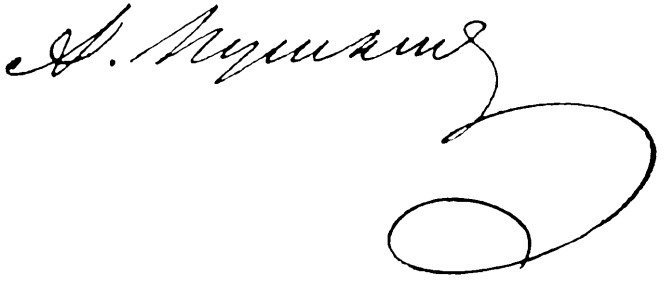

پوشکن

شعر و شاعری

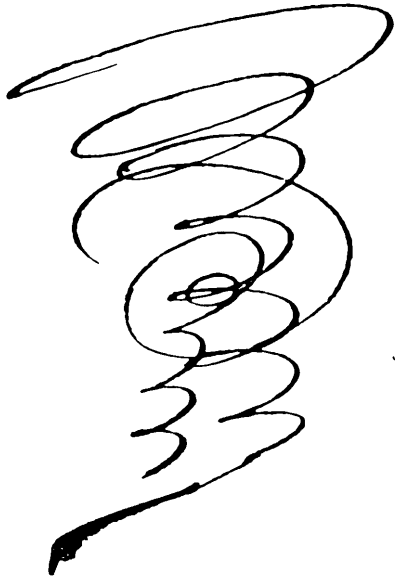

منظوم ترجمہ ظ انصاری

ڈیزائن : براباش
(پوشکن کی بنائی ہوئی تصویروں کی بنیاد پر)

فہرستِ عنوانات

صفحہ نمبر

تعارف	۷	
Разлука („В последний раз, в сени уединенья...“) (1817)	۲۳	سلامِ رخصت
Сказки (1818)	۲۴	کہانیاں
К Чаадаеву („Любви, надежды, тихой славы...“) (1818)	۲۶	وہ دن آئے گا ہمدم
„Погасло дневное светило...“) (1820)	۲۷	بول، پَون چکّی !
На Аракчеева („Всей России притеснитель...“) (1820)	۲۹	کون ہے وہ ؟
„Гречанка верная! не плачь, — он пал героем“ (1821)	۳۰	ماتم نہ کر
Узник (1822)	۳۱	قیدی
Птичка (1823)	۳۲	آزادی
Ночь (1823)	۳۳	رات
Телега жизни (1823)	۳۴	زندگی کا چھکڑا
К морю (1824)	۳۵	سمندر سے خطاب
Виноград (1824)	۳۸	انگور
К А. П. Керн („Я помню чудное мгновенье“) (1825)	۳۹	دیدارِ یار
„Если жизнь тебя обманет...“ (1825)	۴۰	فریبِ زندگی
Зимний вечер (1825)	۴۱	جاڑوں کی ایک شام
„В крови горит огонь желанья“ (1825)	۴۳	سینے سے لگ جاؤ
Пророк (1826)	۴۴	پیغمبر
Няне (1826)	۴۶	اپنی آیا سے
„Во глубине сибирских руд“ (1827)	۴۷	جلاوطن دوستوں کے نام
Соловей и роза (1827)	۴۸	گُل و بلبُل
Арион (1827)	۴۹	سوگوار
Поэт („Пока не требует поэта...“) (1827)	۵۰	شاعر
Воспоминание (1828)	۵۲	اعمالنامہ
„Не пой, красавица, при мне“ (1828)	۵۳	یادِ یار
Анчар (1828)	۵۴	زہر بلا بَبُول ۔ "انچار"
Из Гафиза (1829)	۵۶	حافظ شیرازی کے رنگ میں
Зимнее утро (1829)	۵۷	جاڑوں کی ایک صبح

„Я вас любил: любовь еще, быть может" (1829)	۵۹	میں نے چاہا تھا تمہیں
„Брожу ли я вдоль улиц шумных" (1829)	۶۰	ٹھکانا ہو کہیں میرا
"Когда в объятия мои" (1830)	۶۲	جاؤ کاہے کو جھوٹی بناؤ بتیاں
Поэту („Поэт! не дорожи любовию народной") (1830)	۶۳	شاعر سے خطاب
Мадона (1830)	۶۴	"میڈونا" حسن کا پیکر
Элегия ("Безумных лет угасшее веселье") (1830)	۶۵	شام زندگی
Стихи, сочиненные ночью во время бессонницы (1830)	۶۶	نیند جب نہیں آتی
Эхо (1831)	۶۷	صدائے بازگشت
К *** („Нет, нет, не должен я, не смею, не могу...") (1832)	۶۸	حسن جواں
„Пора, мой друг, пора! покоя сердце просит" (1834)	۶۹	شہروں کے ہنگاموں سے دور
Туча (1835)	۷۰	بادل
„Я памятник себе воздвиг нерукотворный" (1836)	۷۱	زندہ یادگار
ПОЭМЫ		**طویل نظمیں**
Кавказский пленник (1820 — 1821)	۷۵	قفقاز کا قیدی
Бахчисарайский фонтан (1821 — 1823)	۱۰۳	باغیچہ سرائے کا فوارہ
Цыганы (1824)	۱۲۴	بنجارے
Медный всадник (1833)	۱۵۱	تانبے کا شہسوار
СКАЗКИ		**قصے**
Сказка о попе и о работнике его Балде (1830)	۱۷۳	پادری اور اس کا خدمتگار
Сказка о рыбаке и рыбке (1833)	۱۸۲	مچھلی اور مچھیرے کی کہانی
Сказка о золотом петушке (1834)	۱۹۴	سونے کا مرغا
		منظوم ناول
Евгений Онегин. Роман в стихах (1823 — 1830)	۲۰۳	ایوگے نی آنے گن (اقتباس)

تعارف

(پیش‌خوانی)

الیکساندر سرگے ئچ پوشکن کم و بیش ۳۷ سال جیا ، (۶ جون ۱۷۹۹ ء کو ماسکو میں پیدا ہوا اور ۱۰ فروری ۱۸۳۷ ء کو پیٹرسبورگ (لینن گراد) میں دنیا سے سدھار گیا) ، عمر بڑی مختصر پائی ، لیکن زندگی بھرپور گزاری ۔ دنیا کے بڑے بڑے جوانامرگ شاعروں اور فنکاروں کی طرح واقعات اور تجربات ، ہنگاموں اور تصادموں سے بھری ہوئی اس مختصر مدت میں اس نے لمبا سفر طے کر ڈالا۔

شاعر ایک ایسے مخلوط‌النسل صاحب‌جائداد اشراف خاندان میں پیدا ہوا تھا جہاں قرض کے اردب میں آنا بھی نسبی شرافت کی نشانی ہوتی ہے ۔ گھر میں علم‌وادب کا چرچا تھا ، الماریوں میں فرانسیسی ناول اور شعرا کے دیوان بھرے تھے ۔ چچا خود اچھے خاصے شاعر تھے اور اپنے وقت کے اہل قلم سے ربطضبط رکھتے تھے ۔ بچوں کی تربیت کی صرف اسی قدر فکر کی جاتی تھی کہ دیہات سے بلوائے ہوئے نوکر چاکر لگے رہیں اور ایک آدھ فرانسیسی اتالیق مقرر کردیا جائے ۔ پوشکن سمیت تین بہن بھائی انھی آیاؤں اور اتالیقوں کی گود میں پلے ۔ ماں ایتھوپیا (حبش) کے کسی ابراھیم ھنی‌بال کی نواسی اور بال بچوں کی فکر سے آزاد خاتون تھیں (جن کا ذکر شاعر کے یہاں نہیں ملتا) ۔ پوشکن کا بیان ہے کہ ان کے پرنانا سیاہ فام شہزادے تھے جنھیں ترکوں نے روس کے اولوالعزم بادشاہ پیٹراعظم کو تحفے میں بھیجا تھا ، بادشاہ نے اپنے ایک نیم جرمن منصبدار خاندان میں اس خادم خاص کی شادی کرادی ۔ تیسری نسل میں پوشکن کے گھونگھریالے بال ، موٹے ھونٹ ، سانولا رنگ ، گٹھا ہوا بدن ، مزاج کی تیزی اور جھلاھٹ ، زندگی کی رواں‌دواں لذتوں میں کھوجانےوالی طبیعت ، اطاعت اور مکمل فرماں‌برداری سے سخت نفرت ایسی خصوصیات تھیں جو ننھیالی رشتے کی یاددھانی کرتی رھتی تھیں ۔ خود شاعر بھی اس پر فخر کرتا تھا، افریقیوں کو اپنا رشتے کا بھائی شمار کرنے اور دیار مشرق کو حسرت سے تکنے میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے ۔ اگرچہ

اس نے ۱۹ ویں صدی کے جرمن شعرا (مثلاً گوئٹے) کی طرح کوئی مشرقی دیوان یادگار نہیں چھوڑا ، تاہم اس کی مختصر اور طویل نظموں میں ، کہانیوں اور تاریخی ناولوں میں ، حافظ و سعدی کے حوالوں میں مشرقی رنگ اتنا بکھرا پڑا ہے کہ جمع کیا جائے تو ایک مشرقی کلیات مرتب ہوسکتا ہے ۔

۱۸۱۱ ء میں گھروالوں نے اس شریر لڑکے کو پیٹرسبورگ کے ایسے بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا جہاں خاص منصبداروں کے بچے شہنشاہ کے گرما محل کے سائے میں اعلا درجے کے دیسی اور ولایتی استادوں کی نگرانی میں رہتے تھے ۔ یہاں پوشکن نے چھ برس تاریخ ، ادب، سیاسی معاشیات اور فلسفے کے علاوہ جدید رجحانات کی تعلیم پائی ۔ یہیں خوش ذوق اور باخبر ماحول میں اس کی شاعرانہ صلاحیت نے رنگ‌روپ نکالا ۔ پہلے تو دینیات کے استادوں ، اخلاق کے محافظوں اور سرکاری عہدہ داروں پر قافیہ‌بند چھینٹے اڑائے ، پھر پندرہ برس کی عمر میں جب اس کی ایک نظم رسالے میں شائع ہوئی اور ہر تقریب پر اس سے نظموں کا تقاضا کیا جانے لگا تو اسکول سے نکلتے نکلتے شاعرانہ حیثیت مان لی گئی ۔ شروع کا کلام آج تک ہر مجموعے میں موجود ہوتا ہے اور اسے ابتدائی مشق کا نمونہ نہیں سمجھا جاتا ۔

سالانہ امتحان پوشکن نے بڑے امتیاز سے پاس نہیں کئے لیکن وقت کے سب سے مستند شاعر درژاوین نے اس کی ایک نظم سن کر جو امتیاز بخشا وہ تمام ملک کے ادبی حلقوں کے لئے ایک سند بن گیا ۔

استادوں کی شفقت ، ہم‌سبقوں کی محبت ، شاہی محل کے باغ میں نازنینوں کے تبسم‌آمیز برتاؤ نے اس نوعمری میں جو نرمی اور گرمی بخشی ہوگی ، وہ تو تھی ہی ، اس کے علاوہ نپولین کی عظیم‌الشان فوج کی روس پر چڑھائی (۱۸۱۲ ء) اور اس کی پسپائی ، تعلیم‌یافتہ فوجی جوانوں کا اسکول کی دیوار کے پاس سے مارچ کرتے ہوئے گزرنا ، فضا میں قومی ترانوں کا گونجنا، یورپ سے فاتح جوانوں کا نئے آزادی پسندانہ خیالات کے ساتھ واپس آنا بھی اس کے ابھرتے ہوئے شعور کو گرما گیا ۔ اور ان کیفیتوں کے جلوے باقی تمام عمر کی شاعری اور نثر میں جابجا جھلکتے ہیں ۔

دوسرے لڑکوں کی طرح پوشکن کو بھی اسکول سے اٹھتے ہی باعزت سرکاری نوکری مل گئی جو تین سال (۱۸۲۰ ء تک) چلی ۔

تھیٹر ، بیلےڈانس ، ادبی شامیں ، ناچ گھر ، ناچنےوالیاں ، شرط بدکر بازی لگانا ، رنگ‌رلیاں ، دھومیں مچانا ، وصل‌وفراق ، طنزومذاق ، مذھب اور حکومت کے عہدہ‌داروں کو نشانہ بنانا اور آبرو پر آنچ آتے دیکھ کر پستول کی گولی سے فیصلہ کرانا ، یہ اس حلقے کے روز کے مشغلے تھے ۔ پوشکن نے یہ چھلکتا ہوا جام بھی پیا اور اس کی تلخی و تیزی بھی اس کے منتخبہ کلام میں '' حدیث دیگراں ،، کے طور پر محفوظ رہ گئی ۔ جب وہ اس محفل کو تج کر اٹھا ہے تو اپنے اردگرد کی شہری '' شریفانہ ،، زندگی کی اتنی گہرائی تک اتر چکا تھا کہ خود جدید روس نے اسے اپنی ابھرتی ہوئی ، تشکیل پائی ہوئی ادبی زبان کا نمائندہ روسانوی شاعر مان لیا تھا ۔

دو سال تک وقفوں کے ساتھ محنت کرکے اس نے اپنی ایک طویل بیانیہ نظم '' رسلان اور لودمیلا ،، ۱۸۲۰ء میں مکمل کی ۔ تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو دنیا کی ترقی‌یافتہ شاعری سے آنکھ ملانے کے قابل تو بنایا ہی ، زبان کو ایسا ایک وزن اور آہنگ بھی عطا کیا جو بعد کی سیکڑوں بیانیہ نظموں کےلئے ایک نمونہ بن گیا ۔ عجب نہیں کہ نظم کا ہیرو ' رسلان ، فردوسی کے شاھنامے والے ' رستم ، کا ہی روسی روپ نکلے ۔

بقول خود پوشکن نے اپنی باقاعدہ تعلیم کی کوتاہی کو مسلسل اور رنگارنگ مطالعے سے پورا کیا ؛ کتابی مطالعے کے علاوہ دوسرے سرچشموں تک بھی رسائی حاصل کی ۔ ایک تو روس اور سرحد روس کے دیہات ؛ جب بھی شہر سے دامن چھڑاتا ، وہ کچی دیواروں اور سچی صورتوں کی بستیوں میں پناہ لیتا ، جب بھی موقع پاتا ، کبھی اجازت لےکر ، کبھی بلا اجازت دیہات کی طرف نکل جاتا ۔ ایک بار جبراً اور دوسری بار اپنی مرضی سے جنوبی علاقوں کی طرف چل دیا جہاں ابھی جابر روسی حکومت کا شکنجہ مضبوطی سے نہیں کسا گیا تھا اور ترکوں ، چرکسوں ، تاتاریوں ، قفقازی قبیلوں سے آئے دن جنگ ٹھنی رھتی تھی ۔ خطر پسند طبیعت نے ان علاقوں سے اپنی بہترین طویل نظموں کا رنگ و آہنگ لیا ہے اور سکون و آزادی کی تلاش نے دیہات میں اپنے بہترین جانفزا نغمے ترتیب دئے ہیں ۔

دوسرا سرچشمہ روس کے سرحدی علاقوں میں جابجا پھیلے ہوئے وہ ذی علم منچلے تھے جو روس کے سر سے شاھی اقتدار کی فولادی چھت

اڑا دینے کی فکر میں اندر ھی اندر سازش کا بارود بٹور رھے تھے۔ ۱۸۲۰ ء اور ۱۸۲۵ ء کے درمیان پوشکن ان سنچلوں سے ربط قائم کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ خود انقلابی حلقے کا باقاعدہ ممبر نہیں بنا، یا نہیں بنایا گیا، (بادشاہ سلامت کی طرح سیاسی انقلابی گروہ بھی اسے '' ناقابل اعتبار ،، سمجھتے تھے) لیکن ان کی آزاد خیالی ، سرفروشی ، ٹکسالی مذھب سے بیزاری ، باغیانہ سرگرمی سے وہ اپنا سینہ آباد کر چکا تھا۔ چناںچہ جب دسمبر ۱۸۲۵ ء میں شاھی جانشینی کے اختلاف کو سپر بناکر ایک باغیانہ جلوس پائےتخت میں سر میدان نکلا اور اسے شکست ھوئی ، بغاوت سے رشتہ رکھنےوالے گرفتار ھوئے ، سولیوں پر چڑھائے اور جلاوطن کئے گئے تو ان کی زبان پر ، ان کے سرو سامان میں سے پوشکن کے خطوط اور اشعار برآمد ھوئے۔ پوشکن اپنی آبائی جاگیر میں تقریباً نظربند تھا ، اس پر نگرانی کڑی کردی گئی۔ اخلاقی اور مذھبی خیالات میں '' بےراہ روی ،، پہلے سے تھی ، اب اس کا '' سیاسی چال چلن ،، بھی مشکوک قرار پایا۔ اور جب تک شاعر زندہ رھا ، والی سلطنت کو خوش رکھنے اور اعزاز حاصل کرنے کی تمامتر کوششوں کے باوجود وہ اس داغ کو نہ دھو سکا۔ یہی داغ ھے جو کچھ زمانہ گزرنے پر '' یدبیضا ،، کی طرح روشن ھوا اور انقلاب ۱۹۱۷ ء نے پوشکن کی زندگی کا ھر ایک داغ دھوکر اسے انقلابی حقیقت‌پسندوں کی صف میں پیشرو قرار دےدیا۔

۱۸۲۰ ء میں پائے تخت میں پوشکن کی '' گستاخیاں ،، اتنی بڑھ گئیں کہ سزا کے طور پر اس کی فرار کر جانے کی تمنا کو کچھ دلاسا دے دیا گیا۔ جنوب کی روسی چھاؤنیوں میں ، جہاں مطلق‌العنان گورنر جنرل کا راج ھوا کرتا تھا ، پوشکن کا تبادلہ ھوگیا۔ جنوبی علاقوں اور مشرقی ماحول کی گرمی اور سرگرمی میں وہ چار برس تک نشیب و فراز کی زندگی گزارتا رھا۔ ان چار سال کے مشاھدوں کا ، بےلگامیوں اور ناکامیوں کا ، آزادی اور مسرت کے اتنے نزدیک ، اس قدر دور ھونے کا اندازہ کرنے کےلئے سوانح عمری کی تفصیلات چھاننے کی ضرورت نہیں۔ طویل نظمیں '' قفقاز کا قیدی ،، ، '' باغچہ‌سرائے کا فوارہ ،، ، '' بنجارے ،، ، '' ڈاکو بھائی ،، اور مختصر نظمیں مثلاً '' سمندر سے خطاب ،، جس میں نپولین اور بائرن سے عقیدت کا اعلان ھے خود ھی گواھی دینے کو کافی ھیں۔

اسی عرصے میں بندرگاہ اودیسہ کا صدر مقام شاعر کے لئے بڑا زرخیز ثابت ہوا - وہیں عظیم‌الشان منظوم ناول جسے ۱۹ ویں صدی کے روس کی " انسائیکلوپیڈیا "، کہا گیا ہے ، " ایوگےنی انے گن "، کے دو ابتدائی باب لکھ لئے گئے -

سولداویہ کا وہ علاقہ جو ترکوں سے چھینا گیا ، مشرقی بیوپاریوں اور اہلکاروں سے ، ان کی نمائش‌پسند عورتوں سمیت پٹا پڑا تھا جو ہر ممکن تدبیر سے اپنے نئے فاتحوں کو خوش کرنا چاہتے تھے - شاعر کی دوررس نظروں نے یہیں ایشیائی خوشامدپسندی، پسماندگی ، وہم‌پرستی اور بدسلیقگی کے بھدے مناظر بھی دیکھے اور اس کے کلام میں طنز کی دھار اور تیز ہوگئی جو بائرن وغیرہ سے آگے کا قدم تھا -

۱۸۲۲ ء میں بدچلنی اور بدعقیدگی کے الزام میں اسے سرکاری ملازمت اور اودیسہ دونوں سے خارج کرکے یہ حکم سنایا گیا کہ اپنی ننھیالی جاگیر " میخائلوفسکوئے "، گاؤں میں ، سرکاری نگرانی کے سائے میں رہے اور بلا اجازت باہر نہ جائے -

نظربندی کی یہ سزا بھی فنکار کے حق میں ایک رحمت نکلی - جنوب کی ناتمام نظمیں اس تنہائی میں مکمل ہوئیں - قصباتی شرفا کی زندگی کا قریب سے مطالعہ ہوا ، عزیزوں اور دوستوں کے ذریعے کتابیں منگوا کر پڑھی گئیں ، " ایوگےنی انے گن "، کا پورا خاکہ تیار کرکے تیسرا اور چوتھا باب لکھ لیا گیا - انھی دیہات میں وہ کئی سال پہلے کی ملاقاتی ایک نوجوان حسینہ مادام کیرن سے ملا اور " دیداریار "، لاجواب نظم اسی سے منسوب کی - کیرن کے نام پوشکن کے خطوط جو ۵۰ برس بعد خود اسی خاتون نے پریس کے حوالے کئے عشق کی بےتابی اور عیاشی کی بےراہروی کا فرق جتانے کے لئے کافی ہیں - پوشکن دونوں موجوں میں تیر چکا تھا اور اس فرق سے خوب آگاہ تھا -

ان دو برسوں میں جہاں ماں‌باپ سے بگاڑ ہوگیا (پوشکن کے باپ سرکاری ہدایت کے مطابق اس کی ڈاک کھولنے ، پڑھنے اور بعض اوقات روکنے لگے تھے) وہیں اس عمررسیدہ خاندانی آیا (ارینا ردیونونا) کی شفقت نصیب ہوئی جو باقی تمام زندگی روسی جنتا کی سادہ دلی ، بےتکلفی، ہمدردی اور معاملہ فہمی کا جیتا جاگتا نمونہ بنی رہی ، جس نے پوشکن کی کئی خطاؤں کی پردہ‌پوشی کی اور مامتا کی تلافی کرکے

کئی لافانی نظموں میں اس کا صلہ پایا ۔ ''جاڑوں کی ایک شام،، میں اسی سے خطاب ہے ۔ میخائیلوفسکوئے کے گاؤں میں ، جہاں شاعر کا وہ مکان آج تک محفوظ اور شعرا کی زیارتگاہ ہے ، روح سخن یا سرسوتی نے بھی جی کھول کے درشن دئے ۔ اس نے پڑھا بھی بہت اور لکھا بھی معمول سے زیادہ ۔ خاص کر برسات کا موسم ، جب سڑکیں اور گلیاں کیچڑ پانی سے بھرجاتی ہیں ، پوشکن کی ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کےلئے نہایت موزوں ثابت ہوا ۔ (ملاحظہ ہو نظم '' انگور ،، جو بوستان سعدی کی مہک رکھتی ہے ۔)

۱۸۲۶ ء میں تھانے کے مخبر نے جب شاعر کی سرگرمیوں پر اپنی خفیہ رپورٹ تیار کی تو اس میں یہ بھی درج تھا کہ میلوں ٹھیلوں میں عجیب سے رنگین کپڑے پہنے اور لوہے کا لٹھ لیے گھومتا دیکھا گیا ہے ۔ کم‌آمیز اور کم‌گو ہے ، کسانوں میں بغاوت پھیلانے کی بات نہیں کرتا ، البتہ ان سے مساویانہ پیش آتا ہے ، '' گھوڑے کی سواری کرتا ہے اور جب منزل پر پہنچتا ہے تو اپنے آدمی سے کہہ دیا کرتا ہے گھوڑا کھلا چھوڑ دو ۔ آخر جانور کو بھی آزادی کا حق ہے ،، ۔

پوشکن کی تمامتر شاعری میں ہر ذی روح کےلئے آزادی کے اسی حق کی گونج سنائی دیتی ہے ۔ وہ آزادی جس کی حسرت شاعر کو جیتے جی رہی ۔ اس کی ایک شاہکار مختصر نظم '' پیغمبر ،، اسی زمانے میں لکھی گئی ہے جہاں شاعر کو خدائے ذوالجلال کی طرف سے سینہ شق کرکے یہ امانت عطا ہوئی ہے کہ وہ سوتی ہوئی مخلوق کو بیدار کردے * ۔

بامذاق اور ذی علم روشن خیال حلقوں سے فاصلے پر دو برس گزار کر پوشکن اکتا گیا ۔ ۸ ستمبر ۱۸۲۶ ء کو شاہی قاصد دوڑا ہوا پہنچا اور اسے (غالباً بارسوخ دوستوں کی سفارش کی بدولت) ماسکو لےآیا جہاں دربار کی سرپرستی کے بہانے اول تو اسے آلہ‌کار بنانے کی کوشش کی گئی ، پھر اس کی تحریروں اور حرکتوں پر خاص نگرانی قائم کردی گئی ۔ وزیر داخلہ بنکن‌دورف نے شاعر کو نظر عنایت

---

* '' الم نشرح لک صدرک ... ،، (قران : سورۃ السرح آیۃ ۹۴) (Bible: Isaiah) (ظ ۔ ا ۔)

کے شکنجے میں کس لیا جس کی ناگواری کئی منتخبہ نظموں میں نظر آتی ہے۔ '' بظاہر آشنا اور بباطن بیگانہ ،، * شاعر نے یہیں سے اپنے ان جلاوطن باغی دوستوں کو پیغام بھیجے جن سے بے تعلقی کا اظہار کر چکا تھا۔ '' جلاوطن دوستوں کے نام ،، اور '' نوحۂ غم ہی سہی ،، دونوں نظمیں جو ۱۸۲۷ ء میں لکھی گئیں اس انتخاب میں شامل ہیں جو شاعر کی موت کے بعد ہی پوری شائع ہوسکیں۔

دن تو سرکاری وردی میں گزرتے ، شامیں ناؤ نوش کی محفلوں اور قمارخانوں میں ؛ تاہم جب بھی موقع ملتا ، برسات کا موسم آتے ہی وہ رخصت لے کر گاؤں کی طرف نکل جاتا کہ زمانے بھر کی فکروں سے آزاد ہوکر فکر سخن میں خود کو گم کردے۔

ناقدوں کا کہنا ہے کہ بس یہی چھ سات سال کا عرصہ پوشکن کی شاعری کا دور شباب ہے۔ اس نے قومی تاریخ کے محافظ خانے چھاننے شروع کئے ، رزمیہ شاعری کی ، تاریخی ڈرامے لکھے ، مثلاً '' بوریس گودونوف ،، جو شروع میں اسٹیج پر ناکام رہے ، اور تب سے آج تک روس کی تہذیبی زندگی کا ایک جزو بن چکے ہیں۔ بیان ، خطاب ، سوچ اور خود کلامی کو اس بے تکلفی سے شاعرانہ پیوند دیا کہ قوم کی زندہ اور روزمرہ زبان میں کلاسیکی طرز کی صناعی کا رنگ بھی رچ بس گیا۔ منظوم ناول '' ایوگے نی انے گن ،، میں ٹیکنیک کے اس تجربے نے روسی شاعری کو پوری ایک صدی پار کرا دی۔

۱۸۲۷ ء میں ہم خیال دوستوں نے ایک روشن خیال اور جدید رسالے '' نقیب ماسکو ،، کی بنیاد رکھی تو پوشکن نے ہر طرح اس کی مدد کی۔ وہ خود کو جرنلسٹ کہنے میں بھی عار نہ سمجھتا تھا۔

سال بھر بعد اسے پیٹرسبورگ آجانے کی اجازت مل گئی جہاں وہ ایک فیشن ایبل سرائے میں رہ پڑا اور اپنے کلام کی اچھی خاصی رائلٹی (حقوق اشاعت) پر بے فکری کی زندگی گزارتا رہا۔

۱۸۲۸ ء میں بحراسود کے ساحلی علاقوں پر ترکی سے جنگ چھڑی تو پوشکن نے درخواست گزاری کہ اسے محاذ پر بھیج دیا جائے — یہ بھی شاہی سرپرستی اور نگرانی سے فرار ہونے کا بہانہ تھا اور جب

---

* غالب نے ۱۸۵۷ ء کی بغاوت کے سلسلے میں اپنے برتاؤ کے متعلق یہ جملہ ایک خط اور '' دستنبو ،، میں لکھا ہے۔ (ظ۔ ا۔)

بھائی چل نہ سکا تو وہ خود بلا اجازت چل دیا۔ اسے میدان جنگ میں سیاحوں کے سے بےپروا لباس میں لڑتے بھڑتے دیکھا گیا اور ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کردیا گیا۔ اب پائے تخت سے دیہات کے سفر پر بھی سرکاری پابندی لگ گئی۔ اسی زمانے میں اس نے روسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ '' پلتاوا ،، طویل نظم کی صورت میں پیش کیا اور گم‌شدہ '' نیک نامی ،، کمانے کی ایک ناکام کوشش کر دیکھی۔ '' بوریس گودونوف ،، کی طرح یہ نظم بھی روسی تاریخی ادب کا ایک بیش‌قیمت ورق بن چکی ہے۔ اور یہی وہ نظمیں ہیں جن‌میں قدامت پرست روس نے پوشکن کی عظمت پہلی بار پہچانی تھی۔

۱۸۳۰ء میں جب روس کی شاہی فوجوں نے، جو تمام یورپ میں ریپبلک کے برخلاف شاہی حکومتوں کو پھر سے جمانے کا ایک وسیلہ بنی ہوئی تھیں، پولینڈ کی عوامی بغاوت کو کچلا تو پوشکن قوم‌پرستی کی لہر میں یہاں تک بہہ گیا (یا ممکن ہے یہ بھی ایک بہروپ ہو) کہ شہنشاہ اور روسی اقتدار کا قصیدہ لکھ ڈالا اور آزاد خیال جمہوریت پسند دوستوں اور نوجوانوں نے اس قلابازی پر بڑی لعن‌طعن کی جس سے شاعر چونک اٹھا۔

۲۹ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس نے شاعری کے علاوہ تاریخ، تنقید، ناول اور افسانے پر اپنا قلم کچھ کچھ آزما لیا تھا۔ اور اب وہ باقاعدگی سے زندگی اور ادب دونوں کی نثر پر متوجہ ہونا چاہتا تھا کہ ایک معقول ذریعہ معاش ہو، تھوڑی سی جاگیر ہو، گھربار ہو، بیوی بچے ہوں اور جم کر نثری تصانیف پیش کی جائیں؛ جو کچھ لکھا ہے، اس پر نظرثانی کرکے اور جو نامکمل ہے، اسے مکمل کرکے شائع کر دیا جائے۔

۱۷ سال کی ایک گلبدن اور گلفام لڑکی نتالیا گنچاروا کو وہ ماسکو میں پسند کر چکا تھا جس کا نقش دو سال کی لاابالی زندگی بھی دھندلا نہ سکی۔ پوشکن نے کئی بار کی کوششوں سے آخر اس کے والدین کی رضامندی حاصل کرلی۔ '' میدونا ،، نظم، جو اسی لڑکی کے نام ایک منظوم خط ہے یہ بتانے کو کافی ہے کہ وہ حسن کے اس پیکر میں تقدس اور وفا کے آثار دیکھ رہا تھا، اگرچہ وہ بھی اس کی وفا ناآشنا طبیعت سے جلد ہی آگاہ ہوگئی۔

باپ نے ۳۰۰ کمیروں کی جاگیر (بولدی‌نو) بھی اس کے نام

لگھ دی ۔ کتابوں کی آمدنی بھی بڑھنے لگی ۔ کہہ سن کر شاہی پروانہ بھی حاصل کرلیا کہ شاعر کو لطف‌خاص سے نوازا جاتا ہے ۔ لیکن ,, قرض کی ،، جو سے پی‌جا چکی تھی ، جو بازیاں ہاری جا چکی تھیں اور ہونےوالی سسرال کے مطالبے ، شادی کے خرچے — یہ سب رقمیں بھی اس کے ذمے بڑھتی گئیں جو شادی کے چند روز بعد ہی (۱۸۳۱ ء) ساٹھ ہزار روبل تک پہنچ گئیں اور شاعر کی ,, پریشانی ،، اور ,, پشیمانی ،، بڑھاتی چلی گئیں ۔ ,, پشیمانی ،، وہی نظم ہے جسے تالستائی نے زیر مطالعہ منتخب نظموں میں شامل کیا تھا ۔

اسی دور کی ایک لافانی نظم ,, انچار ،، ہے جسے یہاں ,, زہریلا ببول ،، کے عنوان سے ہم نے لےلیا ہے ۔ سلطنتیں کیسے بنتی ہیں ، ظلم ، بےرحمی ، توسیع ، فرد اور سلطنت کا کیا رشتہ ہے — پوشکن جب سارے جتن کرکے دیکھ چکا تو اس پر یہ سادہ سی حقیقت روشن ہوگئی اور اسی سادگی ، بلکہ کھردرےپن سے اس نے وہ مختصر نظم میں بیان بھی کردی : ,, اک تن سے گئی جان تو اک تن کا بڑھا مان ،، ۔

اب پوشکن کو جدید نسل کے روشن‌خیال اہل قلم کی کڑوی تنقیدوں کا بھی سامنا تھا اور صحافت و ادب کے باعزت پیشے میں چھپے ہوئے سرکاری ایجنٹوں اور مخبروں کا بھی ، جو اس کے ایک اک لفظ کو ,, بددیانتی ،، سے تعبیر کرتے اور کیچڑ اچھالا کرتے تھے ۔ نظم ,, شاعر سے خطاب ،، اسی ماحول کی نشاندہی کرتی ہے ۔ ۵ جنوری ۱۸۳۰ ء کو ,, لتراتورنایا گزیتا ،، (ادبی اخبار) نکلنا شروع ہوا (جو آج تک شائع ہو رہا ہے) تو پوشکن اس کی ترتیب اور تیاری میں پیش پیش تھا کہ اب اسے ادبی ذہن کی تربیت کےلئے دریدہ دہن اخباروں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا ۔

,, دو پاٹوں کے بیچ ،، میں بھی وہ ثابت قدم رہا اور اپنی آٹھ سال کی محنت کا پہلا ثمر سوا پانچ ہزار مصرعوں کا منظوم ناول ,, ایوگےنی انے گن ،، منظر عام پر لےآیا ۔ ,, ایوان بیلکن کی کہانیاں ،، لکھ ڈالیں ، اخبار کےلئے تنقیدی مضامین بھیجتا رہا ، اپنی نام‌نہاد جاگیر کچھ سنبھال ، کچھ بگاڑ آیا ، اور کئی مختصر نظمیں لکھ کر شائع کرادیں ۔ پختہ عمر کے یہ دو سال (۱۸۲۹ — ۳۰ ء) ذہنی اور جسمانی اضطراب کے کڑے سال تھے اور انھی میں اس نے اپنے

کئی شاهکاروں کی تکمیل کر ڈالی ۔ ''باضطراب دل ز هر اندیشه فارغیم ''۔ اگر کوئی سال بسال تصنیفوں کی فہرست لے کر دیکھے تو معلوم هو که پوشکن کی غنائی اور بیانیه شاعری کا سب سے قابل قدر حصه شادی کے دن سے پہلے کے ڈیڑھ سال میں تکمیل کو پہنچا یا منظر عام پر آگیا تھا ۔ ۱۸ فروری ۱۸۳۱ ء کو ''نفاست و حسن کے اس نمونے '' نتالیا سے شادی انجام پا گئی جو خاندان کے مسائل ، مصارف ، تقاضے ، تصادم اور رقابتوں کا آغاز بھی اپنے ساتھ لائی تھی ۔

شاعر نے شادی شده زندگی کے چھه سال سکون ، تاریخی ذخیرے ، نثر اور افسانے کی منطقی ترتیب کی تلاش میں صرف کئے ۔ ''چلو مرے عزیز ، وقت آگیا '' اسی تیره برس چھوٹی ناز پرورده اور شوخ ادا دلھن کے نام ایک خط هے جس پر بادشاه سلامت بھی مہربان هو گئے تھے اور نوجوان ، منچلے منصبدار بھی ۔ ''بادل '' اس جابر بادشاه سے خطاب هے جو فضا کو تنہا اپنی ذات سے گدلائے دے رها هے ۔ ''تانبے کا شہسوار '' طویل نظم روس کے شاهی خاندان کی عظمت جتانے کی نیت سے لکھی گئی تھی لیکن اسے درباریوں نے پیٹراعظم کی شان میں گستاخی قرار دیا اور اهم حصے تراش کر هی شائع کرنے کی اجازت ملی ۔ ''کپتان کی بیٹی '' میں کسان باغی ایک هیرو نظر آتا هے ۔ ''بےخوابی کی رات '' کو نظم منسوب کی جاتی هے ۔ جب تاریکی میں شاعر زندگی کا مفہوم ٹٹول رها هے ۔ پوشکن کی نظموں میں اداسی ، بیزاری ، اور وردی‌پوش محفلوں سے جان چھڑانے کی زیریں لہر اب واضح طور سے ایک موج متلاطم بن کر سامنے آتی هے ۔ ''اندیشه هائے دورودراز '' اسے گھیر لیتے هیں اور موت کے دھندلے سائے کو وه منھ توڑ جواب دیتا هے که

میری هستی کو بھلا کیا موت کر سکتی هے پست ؟

وه ماضی کو پلٹ پاٹ کر دیکھتا هے ۔ گاؤں کا گھر ، بوڑھی آیا اور مہربان دوست ، جنھیں موت یا مطلق‌العنانی نے اٹھا لیا تھا ، یاد آنے لگتے هیں ۔ لڑکپن کی سنی‌سنائی کہانیوں کو وه عوامی لہجے اور بےتکلف زبان میں نظم کردیتا هے ، جو آگے چل کر ایک شاعرانه چلن بن گیا ؛ نیم تاریخی ، نیم افسانوی مضامین لکھتا هے ؛ نثر کو نہایت ساده اور دلکش بنانے میں اپنا خون جگر صرف کرتا هے ۔ کرم خورده تاریخی داستانیں چھانتا هے اور غنائی شاعری سے

قطعی ہاتھ دھو لیتا ہے۔ ۳۵ برس کی عمر آتے آتے اس وضع کی شاعری بھی اس سے منھ موڑ چکی تھی۔

آخر قرضے کے دباؤ اور نگرانی کی شدت کے علاوہ بیوی کی بےوفائی کی افواہوں اور بےپروائی کی اداؤں نے اس کے صبروضبط کا پیمانہ چھلکا دیا۔ مردانہ حسن کا نمونہ ایک فرانسیسی نوجوان د'آنتھیس، جسے ڈچ سفیر ہیکرن نے بیٹا بنا لیا تھا اس منظر پر ابھرتا ہے۔ رقابت کے جوش میں پوشکن نے اسے ڈوئل کےلئے چیلنج کیا اور عمر بھر کا اعلا نشانہباز شاعر ۸ فروری ۱۸۳۷ء کو اسی نوجوان کی گولی کا شکار ہوگیا۔ زندگی کی تمام دل فریبی اور خوبصورتی سے شاعر کو جو بےپناہ محبت تھی، اس نے بھی کچھ کم رقابتوں کو نہیں ابھارا تھا۔ اگر ایک رقیب کی گولی نہ ہوتی تو یہ دوسری رقابتیں اسے مار ڈالنے کو کافی تھیں۔

کیا پوچھے ہے وجود و عدم اہل شوق کا
خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

(غالب)

دو دن بعد جب اس کی موت کا اعلان ہوا ہے تو سوگواروں کا غضبناک ہجوم اتنا زبردست تھا کہ میت پوشیدہ طور سے شہر کے باہر لے جاکر دفن کرنی پڑی۔

وہ شاعر جسے وارثتختوتاج اپنے ہاتھ تلے کا والٹر اسکاٹ بنانے کی تمنا کرتے تھے اور نوجوان آزادی پسند اہلقلم اور مداح جس میں والٹیر اور بائرن کی مخلوط روح دیکھا کرتے تھے، ۳۷ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے ادب کا ایک نزاعی مسئلہ بن گیا۔ ''دوبروفسکی،، ''کپتان کی بیٹی،، اور ''حکم کی بیگم،، تین پختہ کار اور مختصر حقیقتپسند ناولوں نے اسے نثر کے میدان میں ابھارا لیکن آنکھ بند ہونے سے پہلےتک وہ وقت نہ آیا تھا جب بلند بانگ قدرداں اٹھکر اعلان کرتے کہ پوشکن روس کی عظمت کا نشان ہے، لو، دیکھو، سارا روس اس کے شاعرانہ وجود میں سمٹ آیا ہے۔ ۱۸۴۸ء تک بلینسکی نے اپنے مضامین سے اور چالیس سال بعد دستوئیفسکی نے اپنی شہرہآفاق تقریر میں پوشکن کو ہر ایک بحث سے اونچا اٹھا دیا اور اس ستون پر نصب کردیا خس کے آگے قصر شاہی کا منارہ جھک جاتا ہے۔

۱۹ویں صدی ختم ہوتے ہوتے تمام دنیا کے ادب نے تسلیم کرلیا کہ پوشکن کو روسی زبان و ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو فردوسی کو فارسی میں، شیکسپیر کو انگریزی میں اور گوئٹے کو جرمن میں۔

۱۹۳۷ء میں جب شاہی کے سلیبے پر نئی تعمیر کا اہتمام جاری تھا، پورے ملک نے پوشکن کی صدسالہ برسی منائی اور اس کی نظم و نثر کی تصانیف نہایت علمی احتیاط، سلیقے اور نفاست کے ساتھ شائع کی گئیں تو دس ضخیم جلدوں میں ان کی شیرازہبندی ہو سکی۔ پوشکن نے مرنے سے سالبھر پہلے جو شاعرانہ پیش گوئی (''یادگار'' میں) کی تھی، وہ دو نسلوں کا وقفہ گزرتے ہی پیغمبرانہ ثابت ہوئی اور غالب کے اس ہمعصر کو عین اسی زمانے میں نئی زندگی اور بازگشت میسر آئی جو برصغیر میں غالب کو مقدر ہو چکا تھا۔

مختصر اور طویل نظمیں جو یہاں انتخاب کی گئیں ان میں قریب قریب بیس سال کی شاعری کا نمونہ اور شاعر کے مختلف لمحوں اور کیفیتوں کا ایک ایک جلوہ نظر آتا ہے۔ مکمل تو نہیں، البتہ لفظی اور معنوی خصوصیات کی کسی حد تک نمائندگی ہوگئی ہے۔ یہاں پانچ ہزار کے قریب مصرعے سمائے ہیں جو ابھی تک مشرق کی کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوئے، بعض طویل نظمیں انگریزی جیسی جامع زبان میں بھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔

اگر شاعری کو فقط اختصار اور اشارے کی دلفریب زبان ہی سمجھا جائے تو یہ منظوم ترجمے کسی کام کے نہیں رہیں گے کیوں کہ ہمارے یہاں مصرعوں کی تعداد اگرچہ اصل کلام کے لگبھگ رہی، لیکن الفاظ کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ شاعر کے خیالات کی روشنی کہیں لفظ پر نزدیک سے پڑتی ہے، کہیں فاصلے سے؛ اس کے لفظوں کا قدوقامت روسی زبان کے سانچے کے مطابق ہے اور آہنگ بھی دوسرا ہے۔ جو بات اس کےلئے سہل ہے، وہی دوسری زبان کےلئے دشواری بنجاتی ہے۔

کمویش پچاس مختصر اور طویل نظموں اور منظوم کہانیوں کا ترجمہ ایک زمانے بعد مکمل ہوا، پھر بھی وہ حسن اور سادگی،

جوش اور موسیقی جو پوشکن کا حصہ ہے ، ترجمے کی ریشمی ڈوری اپنی گرفت میں نہ لے سکی۔ اس کا اندازہ کرنے میں چشم تصور سے بھی کام لینا پڑے گا: '' قیاس کن زگلستان من بہار مرا ،، ۔

پوشکن کے کلام کو اردو لباس پہناتے وقت مجھے اپنی صابر و شاکر اور دل‌نشیں زبان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ مثنوی کی بیانیہ گنجائشیں ، نظم کی وسعتیں ، گیت کا رس ، مرثیے کا جس ، غزل کی اشاریت اور لوچ ، رباعی کا اختصار اور سوچ اور ان کی مجموعی سمائی پر ، پہنائی پر نظر گئی تو میں حیران رہ گیا ہوں کہ بعض اوقات اصل کے تین تین مصرعے آدھے لفظوں میں ہی بس گئے اور کچھ پھنس پھنسا کر نہیں ، بلکہ ہنستے کھیلتے ، مثلاً

نوجوانی کے خواب میٹھے سال
تمتماتے ہیں ان کی آنچ سے گال

تین مختصر نظموں ، '' وہ دن آئے گا ہمدم ،، '' رات ،، اور '' آزادی ،، کا آزاد ترجمہ مشہور شاعر جاں‌نثار اختر نے کیا ہے جسے ہم نے جوں کا توں ، شکریے کے ساتھ ، یہاں شریک کرلیا۔

طویل بیانیہ نظموں میں سب سے صبرآزما مرحلہ '' ایوگے نی انے گن ،، کا تھا جسے آج بھی روسی ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ ہم نے اس کا صرف دسواں حصہ نکال لیا تاکہ سب سے اہم ، جاندار کردار '' تاتیانا ،، اپنی پوری شان سے جلوہ‌گر ہوسکے۔ قافیوں کی ترتیب صرف پہلے بند میں اصل کے مطابق رکھی گئی اور باقی بندوں کے قافیے معنوی خصوصیات کے پیش نظر ترتیب دئے گئے، تاکہ قافیوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنے میں شاعر سے بےادبی نہ ہونے پائے۔

بحریں اصل کے قریب ہیں ، اصل کے مطابق یا ہم‌آہنگ نہیں ، مشرق و مغرب بہت طویل کوشش اور تربیت کے بعد ایک دوسرے کی موسیقی اور ترنم کا لطف تو ضرور اٹھانے لگے ہیں لیکن سانچے تب بھی مختلف تھے، آج بھی ہیں اور ابھی صدیوں تک مختلف رہیں گے۔ کتنی ساری صدیوں میں بنے ہیں یہ سانچے ! نظموں کے عنوان میں اردو فارسی کے اہم شعرا کا اقتباس بالکل بےساختہ اور قدرتی ہے۔ زمین، زبان اور زمانے کے فاصلے کے باوجود فنکاروں کی روحیں کیسی ہم‌آہنگ ہوتی ہیں !

میں نے اردو میں اب تک کے شائع شدہ تمام اہم منظوم ترجمے دیکھے ہیں۔ ''طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض،، لیکن ابھی تک منظوم ترجموں کا رواج نہیں پڑا جیساکہ انگریزی، جرمن اور روسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ خصوصاً روسی زبان میں تو فارسی، فرانسیسی اور انگریزی شاعری کے ایسے اعلا تراجم موجود ہیں جن پر اصل سے بڑھ جانے کا گمان گزرتا ہے۔ انھی نمونوں کے پیش نظر میں نے بھی بعض اوقات وہ آزادانہ برتاؤ روا رکھا ہے جسے کہنا چاہئے کہ '' ذرا سی دیر کو ہم بھی بہک کے چلتے ہیں ،،۔ اگر اس کام کو شایان شان داد ملی تو عین ممکن ہے کہ آئندہ میری ہمت بندھے اور مجھ سے بدرجہا بہتر اہل سخن کو توفیق ملے۔ والسلام۔

ظ۔ انصاری

۳۰ جون ۱۹۷۲ء

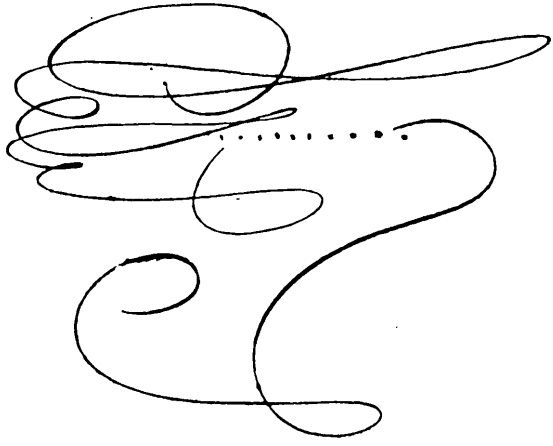

سلامِ رخصت

(ہم سبق کو خیل‌بیکر کے نام،
اسکول کے آخری امتحان کے موقع پر)

آخری بار ، گھنی چھاؤں میں ، اشعار مرے
بزم احباب سے رخصت کےلئے آئے ہیں -
میرے اسکول کے ساتھی ، مرے پیارے بھائی
آخری لمحوں میں ، آ تجھ سے گلے مل لوں میں -
اب نہ ہم ہوں‌گے ، نہ یہ صحبت یاراں ہوگی
نہ وفا مہکےگی ایسی ، نہ بہاراں ہوگی -

رخصت اے دوست ، خدا تجھ کو سلامت رکھے
چھوٹنے پائے نہ آزادی وفن * میرے بعد ؛
راس آئے تجھے الفت کا چلن میرے بعد !
جو محبت مری نظروں سے رہی دور ہی دور
بخش دے تجھ کو امنگوں کا ، ترنگوں کا سرور
تیرے دن خواب کی آغوش میں جھولا جھولیں
راحتیں ہوں ترے دامن میں ، تری خوشبو لیں !

الوداع ! چاہے کہیں ہوں میں ، کسی حال میں ہوں :
جنگ کی آگ ہو یا چین کی نگری کا مزا
تم سے جو عہد وفا ہے ، وہ نبھا جاؤں‌گا -
سن لے تقدیر دعائیں یہ مری ، یاد رہیں
تیرے سب دوست ، سبھی یار ترے شاد رہیں !

۱۸۱۷ء

---

* پوشکن نے Feb (Фебъ) کا لفظ لکھا ہے جو انگریزی میں اپالو ، یعنی روم قدیم میں فنکاری کے دیوتا کا ہم‌معنی ہے - (ظ - ا -)

کہانیاں

روس نگر میں ڈنکا باجے
گھوبے راج سواری
پھوٹ پھوٹ کے عیسی روئے ،
روئیں سب نرناری

بی‌بی مریم ننھے کو بہلائے ، کبھی دھمکائے :
"چپ ہوجا ، اے راج دلارے ، زار ہے روسی راجا
ہوا آیا ، ہوا آیا ، سن‌لے ڈنکا باجا ،،
زار نے یوں فرمان سنایا :

روسی جنتا ، جان لے تو بھی ، جانے سب سنسار
آسٹریا، پروشیا والے
سب نے مان لیا ہے ہم کو
ہم نے کمر کس لی ہے اپنی ، وردی ہے تیار -

دھوم مچاؤ ، دیکھو ، ہم ہیں پیٹ بھرے مشٹنڈے
اونچا نام ہمارا ، مالا جپتے ہیں اخبار
کہا پی‌کر اک قول دیا ہے —
قول سے خوش ہوجاؤ لوگو ، خوب بجاؤ ڈنڈے

سن لو ، آگے کیا کرنا ہے
جو سن لے وہ جانے :
لاوروف کو باہر کرکے
سوس * کو پاگل خانے ؛

---

* لاوروف اور سوس — زار الیکساندر اول کے زمانے میں سنسر کمیٹی کے عہدیدار ، اہل قلم ان کی سخت‌گیری سے نفرت کرتے تھے - (ایڈیٹر)

گورگولا * کی کرسی پر اب بیٹھے گا قانون
جنتا اپنا حق پائے گی (رال بہے نہ خون)
رحم کیا پرجا پر ، ہم نے ، کرتے ہیں احسان
عام ہوا فرمان،،

جھولے میں یہ سن کر بچہ
خوش خوش اچھلے کودے
،، کیا سچ مچ اب ایسا ہوگا ؟
یا ہے یہ بھی غچہ ؟ ،،

بی بی مریم پیار سے تھپکے ،، سوجا راج دلارے
رات ہوئی اب ، آنکھیں میچ لے ، سوجا میرے پیارے ،
سن راجہ باپو کی زبانی
کہتا ہے اچھی سی کہانی ،،

۱۸۱۸ء

---

* یونانی دیومالا میں آدم‌خور بھوت ۔ (ایڈیٹر)

وہ دن آئے گا ہمدم

ترانے یہ محبت کے ، یہ امیدوں کی شہنائی
یہ خاموشی سے بڑھتی شہرتوں کی جلوہ آرائی
یہ رنگیں دل‌ربا دھوکے ہمیں اپنا نہیں پائے
یہ بہلاوے بہت دن تک ہمیں بہلا نہیں پائے
کوئی دم میں جوانی کا فریب‌آرزو ٹوٹا
حقیقت جب کھلی، تو یوں طلسم‌رنگ و بو ٹوٹا
کہ جیسے انکھڑیوں سے خواب کوئی دور ہوجائے
کہ جیسے صبح کا کہرا کہیں کافور ہوجائے
دھندلکے چھٹ گئے آنکھوں سے جھوٹی آرزؤں کے
ہمارے دل میں لیکن زندگی کی شمع روشن ہے
ہوا کیا وقت کے منحوس فولادی شکنجے میں
اگر اپنی تڑپتی روح کا خاموش مسکن ہے
ہماری روح پھر بھی گوش برآواز رہتی ہے
کہ ہونٹوں پر وطن کے ہر گھڑی فریاد وشیون ہے
امیدیں مضمحل ہیں، پھر بھی آزادی کے لمحے کا
اسی بےتاب شدت سے ہمیں ہے انتظار اب تک
جو خاصہ ہے فقط ایسے مچلتے نوجواں دل کا
جسے تڑپا رہا ہو وعدۂدیدار یار اب تک

ابھی رگ رگ میں اپنی ، زندگی کی آگ باقی ہے
ابھی تو آبرومندی کا دل میں راگ باقی ہے
تو آؤ دوست اس اپنی زمیں کو اک چمن کردیں
ابلتے ولولوں کی زندگی نذر وطن کردیں
یقیں رکھنا مرے ہمدم یقین اس جہد پیہم پر
وہ تارا جو ہر اک دل کو خوشی سے گھیر لیتا ہے
وہ تارا زندگانی کے افق پر جلوہ گر ہوگا
ہمارا روس جو مدت سے گہری نیند سوتا ہے
یکایک جاگ جائےگا جو اعلان سحر ہوگا
نظام کہنہ سے ٹوٹے ہوئے ایک ایک ٹکڑے پر
ہمارا اور تمہارا نام ہی زیب‌نظر ہوگا

۱۸۱۸ء

بول، پون چکی!

(وہ تیرا دعویٰ ترک محبت کیا ہوا حسرت؟
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ھیں)
(حسرت موھانی)

دن کا تارا ڈوب گیا
نیلے سمندر پر پھیلی شام کے کہرے کی چادر
بول پون چکی شوں شوں، تیرا پہیہ چرخ چوں
گھور سمندر لہریں لے، لہریں میرے پاؤں تلے

دور کنارے کی دنیا
دھوپ بھری دھرتی کے طلسمی دیسوں کا پیارا منظر
سینے میں ھے ایک تلاطم، کیوں کر ساحل کو چھولوں
بیتے دنوں کی یادوں سے جی ڈوب رہا ھے شام ڈھلے

دامن بھیگا آنکھوں کا
دل پر پھر جانے پہچانے سپنوں نے ڈالا سایہ
تن میں شرارے، روح لرزتی ھے تھر تھر
کیسے دوانے دن گزرے ھیں، کیا تھا وہ الفت کا جنوں!
آج وھی ھیں دل کو پیارے، دل پر جن کے تیر چلے
ارمانوں اور امیدوں کا رنگ اترا، ٹوٹا افسوں
بول پون چکی شوں شوں، تیرا پہیہ چرخ چوں
گھور سمندر لہریں لے، لہریں میرے پاؤں تلے

دور کہیں مجھ کو لے جا
تیز ھوا میں بہنےوالے جہاز چلاچل موجوں پر
لہر بھر کے ناز اٹھاتا دور کناروں تک پہنچوں
میرے دیس، مری دکھیا نگری کے دھند سے چل بچ کر
دیس جہاں چنگاری سلگی اور جذبے شعلوں میں پلے

میرا دیس جہاں التساہ نے سینے کا پٹ کھولا تھا
جس میں کلا کی دیوی* نے مسکا کر گھونگھٹ کھولا تھا
دیس جہاں آغاز جوانی کی پہلی کونپل پھوٹی
دیس جہاں طوفان اٹھا اور ساری پھلواری لوٹی
دیس جہاں سکھ چین نے مجھ کو چھب دکھلا کر منھ پھیرا
سونپ دیا غم کے ہاتھوں میں دل میرا

کھوج نیارے رنگوں کی ، دور مجھے لے آئی ہے
تجھ کو تج کر نکلا ہوں اے میرے پرکھوں کے وطن ؛
عیش و طرب کے متوالو ، تم سے جان چھڑائی ہے ؛
سیلانی ہے عہد جوانی ، سیلانی کے یار ہو تم
اور تم پینگ بڑھانے والی، راہوں کو الجھانے والی، نام بڑے، تھوڑے درشن
راحت کھوئی ، لاج گنوائی ، اپنی مرضی ہاتھ سے دی
پیار کیے بن خود کو الٹایا تم پر ، جھوٹا پیار ہو تم
تم کو بھی میں بھول چلا ہوں ، صبح بہاراں کی کلیو
اے میری مرادوں کی گلیو ،
پریم کے بھاؤ مدھر تھے لیکن پریم بڑا ہرجائی ہے -
بھول چلا ، پر زخم ہرے ہیں ، کیوں کر اپنے زخم بھروں !
بول پون چکی شوں شوں ، تیرا پھیہ چرخ چوں
گھور سمندر لہریں لے ، لہریں میرے پاؤں تلے-

۱۸۲۰ء

---

* روح فن و سخن - (ظ - ا -)

کون ہے وہ ؟

گلے پر روس کے ہے اس کا پنجہ
گورنر پس گئے ایسا شکنجہ
سبق دیتا ہے ساری کونسل کو
لیے مٹھی میں شاہنشہ کے دل کو ۔
بڑا بدذات ہے اور کینہ جو ہے
ذہانت ہے، نہ پاس آبرو ہے
بتاؤ کون وہ ؟ ''سچا نمک خوار،،
..... سرداروں کا سردار ؟

۱۸۲۰ء

---

* Аракчеев — سچا نمک خوار، رسالے کا چیف، ارکچیئف جو '' بےاعتدالی ،، کو کچل ڈالنے میں مشہور تھا ۔ نقطوں کی جگہ لفظ ارکچیئف موزوں ہوتا ہے ۔ یہ نظم بھی ان سیاسی ہجویات میں سے ہے جو اندر ہی اندر نقل ہوتی اور گشت کرتی رہیں اور شاعر کی موت کے کوئی پچاس سال بعد منظر عام پر آسکیں۔ (ایڈیٹر)

ماتم نہ کر

یونان کے سپوت کو اے باوفا ، نہ رو
دشمن کی گولی سینے پہ کھاکر گرا ہے وہ۔
روتی ہے کیا کہ تونے ہی ناموس و ننگ پر
قربان ہونے بھیج دیا اس کو جنگ پر
شاید جتا دیا ہو جدائی کی رات نے
چھوڑا نہ تیرا ہاتھ شریک حیات نے
بچے کو جب گلے سے لگایا بچشم نم
' آزاد ہونے آؤ ، پکارا سیہ علم *
لہرائے اپنی تیغ ارستوگتاں ** چلا
گھمسان کی لڑائی تھی ، مرنے کا حوصلہ
اک مقصد عظیم کے رخ پر گیا ہے وہ
اس کو نہ رو کہ کام بڑا کر گیا ہے وہ

۱۸۲۱ء

---

* یونان کی جنگ آزادی کا جھنڈا سیاہ تھا۔ (ایڈیٹر)

** ارستوگتاں — اتھینز کا نوجوان جس نے آزادی کی جنگ میں ظالم گپارخ کو مار ڈالا تھا اور اس کے محافظ کے ہاتھ سے مارا گیا (چھٹی صدی ق۔ م۔) (ایڈیٹر)

قیدی

"تو شاہیں ہے ، بسیرا کر ، پہاڑوں کی چٹانوں میں"
(اقبال)

سیلے ہوئے زنداں میں ہم دونوں اسیرغم
قیدی کی غذا پر اک شاہیں کا بھی سر ہے خم
پنجوں میں لیے بوٹی ، یہ سونس تنہائی
پرواز سے بےبس ہے پرواز کا شیدائی

ہے چونچ لہو میں تر ، بل کھائے ہوئے شہپر
کیا جانیے ، اس کو بھی آتا ہو خیال اکثر
نظروں سے جتاتا ہے ، دیتا ہے صدا مجھ کو
کرتی ہے مخاطب یوں شاہیں کی ادا مجھ کو :

"آزاد پرندے ہیں ہم دونوں ، چلو چل‌دیں !
اس سمت ، جہاں بادل پھرتے ہیں پہاڑوں میں
اس سمت ، جہاں نیلے ساگر میں لہر مچلے
اس سمت ہم اٹھلائیں اور باد سحر مچلے"

۱۸۲۲ء

آزادی

دور ہوں ، دور اپنے وطن سے
دل ہے احساس غم کا ستایا
اجنبی سرزمین اجنبی ہے
کون اپنا ، ہر اک ہے پرایا
لے کے ایسے میں اجلا تبسم
موسم گل کا تیوہار آیا
ایک طائر کو آزاد کرکے
جشن نوروز میں نے منایا
میں نہ الفاظ میں کہہ سکوں گا
آج جتنا سکوں میں نے پایا
اب زمانے کے جوروستم کا
تجھ سے شکوہ کروں کیا خدایا

مطلق الحکم شاہنشہی کا
سہہ رہا ہوں اگرچہ ستم میں
کیسی مبہم مسرت ہے دل کو
سوچتا ہوں یہی دمبدم میں
خود گرفتار ہوتے ہوئے بھی
ایک ذی روح کو کم سے کم میں
دے سکا ہوں رہائی کا تحفہ
خوش‌دلی ، خوش‌نوائی کا تحفہ

۱۸۲۳ ء

رات

میری آواز جو تمہارے لئے ، ایک راحت بھی تھی ، اذیت بھی
آج شب کی خموشیاں اس سے ہر نفس چونک چونک جاتی ہیں
ایک افسردہ شمع جلتی ہے میرے اجڑے ہوئے شبستاں میں
جس کی کرنیں ، بجھی بجھی کرنیں اور بھی تیرگی بڑھاتی ہیں
میں کہ رہ رہ کے ڈوب جاتا ہوں اپنے اشعار کی روانی میں
وادیاں جانفزا خیالوں کی دور تک پھر سے لہلہاتی ہیں ۔
سہمی سہمی تمہارے خوابوں سے ، چھلکی چھلکی تمہاری یادوں سے
یہ محبت کی نرم دھارائیں ، سرسراتی ہیں ، گنگناتی ہیں ۔
ٹوٹ جاتا ہے بک بیک جیسے چھایا چھایا فسوں اندھیرے کا
پھر تمہاری حسیں حسیں آنکھیں میری آنکھوں میں مسکراتی ہیں
(خود ہوا سے سبک کوئی سایا) پاس آتا دکھائی دیتا ہے
رات کی اس گھنی خموشی میں مجھکو ایسا سنائی دیتا ہے
" مجھکو پہچانتے نہیں ہو کیا ، میں تو شعروں سے تم کو پیاری ہوں
میرے محبوب میری جاں مرے دوست ! میں تمہاری ہوں میں تمہاری ہوں "

۱۸۲۳ ء

زندگی کا چھکڑا

کیسے مزے میں جاتا ہے چھکڑا بھرا ہوا
بوجھل ہے ، چرچراتا ہے چھکڑا بھرا ہوا
بوڑھا ہے کوچوان ، زمانہ ڈھلان پر
گھوڑا اڑائے جاتا ہے چابک کی سان پر

چل چل رے چھکڑے صبح کے بیٹھے ہوئے ہیں ہم
سر گھومتا ہے ، گھومنے دو ، ہم ہیں تازہ دم
ہاں کوچوان چال دکھا دو مزا رہے
اپنی بلا سے ، جائے یہ آرام یا رہے

دوپہر ہوتے ہوتے ، یہ ترکی ہوئی تمام
دکھتا ہے جوڑ جوڑ ، ذرا تھام باگ ، تھام
ڈر لگ رہا ہے ڈھال سے ، ترچھی چڑھائی سے
ہاں کوچوان بچ کے ، سنبھل کے ، صفائی سے

چھکڑا تو اپنی چال ہی چلتا رہا مگر
جب شام ہونے آئی تو ہم ہوگئے نڈر
اب اپنے اپنے رین بسیرے کو چل دیے
گھر تک پہنچ ہی جائیں گے ہم سوگتے جاگتے
خود وقت کوچوان ہے ، گھوڑے سدھے ہوئے

۱۸۲۳ء

سمندر سے خطاب

الوداع ، اے فطرت آزاد ، میں
چل دیا ، یہ آخری دیدار ہیں
تو ہے اپنی نیلی موجوں میں مگن
حسن میں تیرے غضب کا بانکپن

جیسے ہوتی ہو جدائی ناگوار
برہمی دکھلائے چلتے وقت یار
یوں ہی تیرا شور پیہم ، دکھ بھرے دل کی پکار
رخصتی ہے ، سن رہا ہوں جاتے جاتے ایک بار

میرے ارمانوں کی سرحد تھی یہاں
تیرے ساحل بارہا میرے قدم چومتا کیے
سر جھکائے سوچ میں پہروں یہاں گھومتا کیے
ان کہی ، انجانی باتوں نے کیا ہے نیم جاں

تیری آوازوں میں کیا لگتا تھا جی
کس قدر ڈوبی ہوئی ، کتنی اتھاہ
اور وہ شاموں کی خاموشی میں سناٹا ترا
بےقراری ، جوش فطرت ، برہمی !

ماہی گیروں کی پرانی بادبانی کشتیاں
نرم لہروں میں پھسلتی ، تیرتی
تیرے سینے پر مزے میں ہیں رواں :
ہاں شرارت پر اتر آئے تو بےقابو ہے تو ،
غرق ہوں بیڑے جہازوں کے ، ڈبو دے آبرو

چاہتا تھا چھوڑ دوں ان کو ہمیشہ کےلیے
دل رہا بےکیف اور بےحس کناروں سے نفور ،

تیری جولانی مبارک ہو تجھے؛
آرزو تھی سیل بےپایاں میں کشتی ڈال کے
فطرت شاعر نکل‌جائے کہیں ساحل سے دور

تو نے میری راہ دیکھی اور بلایا بھی ... مگر
پاؤں میں زنجیر تھی، گردن میں طوق
لاکھ سر پٹکا نہ نکلا قید سے کوئی مفر
میں کہ تھا حسرت‌زدہ، تکتا رہا طوفان شوق

اور اب کاہے کا غم؟
کونسی منزل ہے جس کی سمت اٹھیں‌گے قدم؟
اک ٹھکانا تجھ میں تھا اے بحر ناپیدا کنار
روح کی اس بےقراری کو جہاں ملتا تھا قرار

اک جزیرہ، اک چٹان، اقبال مندی کا مزار ...
خواب شیریں نے دبادی ہے جہاں مٹی تلے
عظمتوں کی ایک زندہ یادگار
دفن ہے اس میں نپولین * کا وقار

انتہائے کرب میں جب آنکھ اس کی لگ گئی
جیسے طوفانوں کا ہنگامہ ہو — اک میت اٹھی
وہ ہمارے ذہن کا آقا، ذہانت کا کمال
ہو گیا ہے ہم سے رخصت بائرن ** شیریں مقال

---

* نپولین بوناپارٹ — زمانہ : ۱۷۶۹ء سے ۱۸۲۱ء تک۔ فرانسیسی سپہ‌سالار جو ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۴ء تک اور پھر ۱۸۱۵ء میں فرانس کا شہنشاہ رہا۔ ۱۸۲۱ء میں بحالت نظربندی سینٹ ہلینا کے جزیرے میں موت ہوئی اور سات سال بعد پیرس لاکر دفن کیا گیا۔ (ایڈیٹر)

** لارڈ بائرن — زمانہ ۱۷۸۸ء سے ۱۸۲۴ء تک۔ شہرہ‌آفاق انگریز رومانوی شاعر جس نے یونان کی جنگ آزادی میں شرکت کےلئے یورپ کو اپنے کلام اور عمل سے ابھارا۔ (ایڈیٹر)

جس کا آزادی ہی خود ماتم کرے ، آنسو بہائے
وہ ہوا آنکھوں سے اوجھل، پھول سہرے کے بڑھائے
اے سمندر بین کر ، آفت مچا ، طوفاں اٹھا
اس بھری محفل سے اب وہ تیرا نغمہ‌خواں اٹھا

تھا وہ تیرا ہی نمونہ ہو، بہو
تیرے سانچے میں ڈھلی تھی اس کی خو
قوت‌وحسرت میں ، گہرائی میں فرد
اتنا سرکش ، اس قدر بےباک مرد !

محفل ہستی تو خالی ہوگئی
اے سمندر ، اب کدھر لےجائےگا کشتی مری ؟
ہر طرف روئےزمیں پر ایک ہی قسمت کا ساتھ
جس جگہ ہے بوند کوئی خیر کی
ہے وہیں ذہنوں پہ پہرہ یا کسی ظالم کا ہاتھ

آ کہ اب رخصت ہوں تجھ سے ،
اے سمندر تیرا بانکا حسن پتھر کی لکیر
دن چھپے کےبعد تیری گونج ، یہ مبہم سی گونج
مدتوں مجھ کو سنائے جائےگی غم کی نفیر

مدتوں سنسان ویرانوں میں ، صحراؤں کے بیچ
میرے دم کےساتھ ہوگی ، ہمسفر بن‌جائیں‌گی
یہ چٹانیں ، دھوپ چھاؤں کی یہ تیری اونچ نیچ
یہ خلیجیں اور موجیں تیرے نغمے گائیں‌گی

۱۸۲۴ء

انگور

گلوں کا رنگ اڑا دے اگر بہار کی آنچ
مجھے نہ شکوۂ فصل بہار ، نے غم گل
نظر فریب ہیں بیلوں پہ خوشۂ انگور
نشیب کوہ میں چھلکے ہوئے یہ ساغر مل

خزاں* میں ہے مری وادی کا حسن قابل دید
خزاں کا روپ سنہرا ، بھرا پرا دامن
ذرا کھنچے ہوئے دانے یہ ، خوش‌نما ، شفاف
ہیں انگلیاں کسی نوخیز ہاتھ کی مثلاً

۱۸۲۴ء

---

* خزاں کا موسم ، جو انگور کے پکنے کا زمانہ ہے ، خود شاعر کو پسند تھا اور بہار کے بجائے اس کی شاعرانہ سرگرمیوں کےلئے بھی ہمیشہ سازگار رہا۔ (ظ۔ ا۔)

دیدارِ یار

وہ لمحہ مجھے یاد ہے بےمثال
جب آنکھوں پہ اترا تھا تیرا جمال
فریب نظر تھا کہ حسن پری
گزرتی ہوئی اک جھلک دیکھ لی

سلگتی ہوئی شام تنہائی میں
بھری بزم میں، جلوہ آرائی میں
سنی ہے وہ کومل صدا دیر تک
کبھی خواب میں دیکھ لی ہے جھلک

گئی عمر... اور ساتھ لیتی گئی
امنگوں کی شورش، مرادوں کے دن
کٹی رات، پھیکی پڑی چاندنی
وہ کومل صدا، اس کی یادوں کے دن

کہیں کالے کوسوں پہ اپنوں سے دور
کٹے ایسے کتنے برس بیش و کم
نہ ذوق سخن اور نہ ایماں کا نور
نہ جینے کی لذت، نہ الفت کا غم

مگر روح جاگی ہے مدت کے بعد
مجھے پھر میسر ہے تیرا جمال
اسی حسن سے آج آنکھیں ہیں شاد
فریب نظر ہے کہ حسن خیال

دھڑکتا ہے دل، جسم کو ہے سرور
ملی دوسری زندگی تازہ دم:
سخن کی تب و تاب، ایماں کا نور
مزا زندگی کا، محبت کا غم

۱۸۲۵ء

فریبِ زندگی

زندگی دے تمھیں فریب اگر
دل نہ میلا کرو، نہو ناراض
دن برے ھیں تو ”بازمانہ بساز“
راحتوں کی یہیں ھے راہ گزر

حال اک دلشکن زمانہ ھے
آسرا آدمی کو ھے کل کا
سب گزرنا ھے، سب ھے اک پل کا
جو گزر جائے وہ سہانا ھے

۱۸۲۵ء

جاڑوں کی ایک شام

وہ برفیلی آندھی چلی زور کی
دھواں دھار ہے سب فضا آرپار
درندے سی گرجے ، دہاڑے کبھی
کبھی جیسے رونے لگے شیرخوار
کبھی چھت پہ ایسی دھما چوکڑی
کہ چھپر کا اڑجائے ایک ایک تار
کبھی جیسے اٹکا ہوا یاتری
دریچے پہ دے دستکیں باربار

ہماری یہ کٹیا غریبا مئو
اجالے سے محروم ، افسردہ دل
تجھے کیا ہوا اے بڑی بی کہ تو
نہ بولے ، نہ چالے ، گئے ہونٹ سل ؟
نجانے یہ طوفان کی ہاؤ ہو
تجھے کرگئی اس قدر مضمحل ؟
نجانے یہ چرخے کی روں روں رئو
سلاتی ہے یا نیند میں ہے مخل ؟

اٹھا جام ، پی ساتھ اے مہرباں
دکھی نوجوانی کی ساتھی ہے تو —
اسی جام میں گھول لیں تلخیاں
کہ ٹھنڈا ہو دل ، گرم ہو کچھ لہو
سنا دے اسی ننھی چڑیا کا گیت
سمندر پرے دن گئے جس کے بیت
وہی گیت گادے کہ لڑکی نئی
سویرے جو پنیا بھرن کو گئی

وہ برفیلی آندھی چلی زور کی
دھواں دھار ہے سب فضا آرپار
درندے سی گرجے ، دہاڑے کبھی
کبھی جیسے رونے لگے شیرخوار
اٹھا جام ، پی ساتھ اے مہرباں
دکھی نوجوانی کی ساتھی ہے تو
اسی جام میں گھول لیں تلخیاں
کہ ٹھنڈا ہو دل ، گرم ہو کچھ لہو

۱۸۲۵ء

سینے سے لگ جاؤ

خون میں ہے تپش تمنا کی
روح تیرے ستم کی ہے شاکی
پیار کرلے کہ تیرے پیار لذیذ
مجھ کو عود و شراب سے بھی عزیز
میری آغوش میں جھکالے سر
سو رہوں میں سکون سے دم بھر
اس سے پہلے کہ دن نکل آئے
اور سرک جائیں رات کے سائے

۱۸۲۵ء

پیغمبر

''شاعری جزویست از پیغمبری''

تشنگی روح کی ہلکان کیے دیتی تھی
خاک میں چھانتا پھرتا تھا بیابانوں کی
دیکھتا کیا ہوں : دوراہے پہ نمودار ہوا
چھہ پروں‌والا فرشتہ ملک اسرافیل

انگلیاں خواب کے مانند سبک اور مانوس
میری آنکھوں کو ہوا لمس جو ان کا محسوس
اک کرن دوڑ گئی ، اٹھ گئے آنکھوں کے حجاب
جیسے سہمے ہوئے شاہیں کی نظر میں تب‌وتاب

میرے کانوں کو چھوا تھا کہ صدا گونج گئی
گھر گھرانے لگی آکاش کی چلتی چکی
کوہساروں میں فرشتوں کی انوکھی پرواز
گہرے پانی میں تھرکتے ہوئے آبی پیکر
سرسراتی ہوئی بیلیں کہیں وادی میں ادھر
دورونزدیک سے آنے لگی ایک اک آواز

کھول کر ہونٹ ، دہن میرا دبایا اتنا
کہ مری فتنہ گر و شوخ و سخن‌ساز زباں
کھینچی تالو سے تو منہ سے نکل آیا فتنہ
سانپ دانا ہے مگر زہربھرا سانپ کا پھن
دے‌دیا پنجۂ‌خونیں نے اسے میرا دہن

تیغ سے سینہ گریباں کی طرح چاک کیا
دل بے‌تاب سے سینے کو مرے پاک کیا

رکھ دیا دل کی جگہ شعلہ‌فشاں انگارہ
آگ بھڑکی تھی کہ شق ہوگیا سینہ سارا

لاش کی طرح بیاباں نے سہارا مجھ کو
دیر تک ہوش نہ آیا جو دوبارہ مجھ کو
دور سے ہاتف‌غیبی نے پکارا مجھ کو :

"قم باذنی ، بکشا چشم ، اٹھا سر اپنا
تو پیمبر ہے ، مری روح ترے سینے میں
خشک‌وتر میں مری آواز ، مرا حکم سنا
پھونک دے صور کہ سوتے ہوئے دل جاگ اٹھیں"

۱۸۲۶ء

اپنی آیا سے

میری پیاری ، مری بوڑھی آیا
اے مری ہمدم و ہمراز برے وقتوں کی
دور ، اس ڈھاک کے بن میں تنہا
تو مری راہ بڑی دیر سے تکتی ہوگی۔
اپنی کھڑکی کے تلے گھر کے بڑے کمرے میں
جیسے پہرے پہ مقرر ، مجبور ،
تکلیوں سے جو چلی آتی ہیں دھاگوں کی تہیں
جھریوں پر ترے ہاتھوں کی چڑھی ہوں‌گی ضرور ۔
ہے ڈگر دور کی ، ویران ہے پھاٹک گھر کا
اٹھ کے رہ جاتی ہیں نظریں ہر بار
وہم آتے ہیں ، ٹھنک جاتا ہے ماتھا تیرا
دل کی دھڑکن نے کیا سانس بھی لینا دشوار۔
جانے کیا بات ہے... کیوں ...

۱۸۲۶ء

جلاوطن دوستوں کے نام

"اک روز لب‌خاموشی سے ٹپکیں‌گی دہکتی تقریریں"
(جوش)

سائبیریا کے سنگلاخ دور دشت میں
تمھارے دل قوی رہیں، عزم سربلند ہو!
رائگاں نہ جائیں‌گی تمھاری کاوشیں
نظر کی لو اٹھی رہے، یہ ولولہ دوچند ہو!

برے سمے کا ساتھ دینےوالی ایک آس ہے
غموں کی باوفا بہن، سدا غموں کے پاس ہے
ہنسی خوشی گزار دےگی دن برے، رکھےگی تم کو تازہ دم
وہ صبح جس کی آرزو ہے، لےگی ایک دن جنم

ہرے بھرے ہیں الفتوں کے، یاد یار کے چمن
مہک اڑےگی سیخچوں کے پار جاکے چوم لےگی پیرہن
مری نوائے شوق جس طرح اڑی، ادھر گئی
تمھاری قید کے مہیب غار میں اتر گئی

یہ بھاری بھاری بیڑیاں گریں‌گی کٹ کے ایک دن
قفس کی تیلیاں اچٹ کے ایک دن
تمھیں خوشی سے راہ دیں‌گی، جب قدم بڑھاؤ گے
تو ہمدموں سے، بھائیوں سے تیغ اپنی پاؤ گے

۱۸۲۷ء

گل و بلبل

"بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل"
(غالب)

باغوں کی خامشی میں، بہاروں میں رات بھر
نغمہ سرا ہے بلبل مشرق گلاب پر
الفت کے راگ سے گل تر بے نیاز ہے
کرتا ہے وجد اور طلب خواب ناز ہے

شاعر تجھے امید ہے کس التفات کی؟
اس حسن سردمہر نے کیا تجھ سے بات کی؟
شاعر کو پوچھتا بھی نہیں حسن کج ادا
دیکھو تو پربہار، پکارو تو بے صدا

۱۸۲۷ء

سوگوار

”نوحۂ غم ہی سہی ، نغمہ شادی نہ سہی“
(غالب)

کشتی میں بہت سے لوگ تھے ہم
کچھ کستے تھے بادبان کی ڈور
چپو پہ لگا رہے تھے کچھ زور
بے صوت و صدا ہمارا سانجھی
تھا جان پہ کھیل جانے والا
یہ بارگراں اٹھانے والا
بےفکر تھا میں کہ گا رہا تھا
دل دوستوں کے بڑھا رہا تھا
اتنے میں ہوا کے بدلے تیور
کشتی کو دیا بھنور نے چکر
سانجھی ہی رہا ، نہ یار باقی
میں رہ گیا سوگوار باقی
موجوں نے کیا انہیں نوالہ
اور مجھ کو کنارے لا کے ڈالا
اب بیتے دنوں کے گیت گاؤں !
اور دھوپ میں چیتھڑے سکھاؤں !

۱۸۲۷ء

شاعر

سرسوتی * نہ جب تک اس کو دے صدا :
کوی کہاں ہے تو؟ ہماری بھینٹ لے کے آ کوی کہیں
جہاں کے چھوٹے موٹے کاروبار میں دبا ہوا
وہ بےدلی سے فکر روزگار میں دبا ہوا پڑا رہے
ستار اس کا بےنوا رہے
نشے میں نیند کے مگن کوی کی آتما رہے
جو مٹ چکے ہیں لذتوں کی راہ میں ،
جو گر گئے ہیں ہوش کی نگاہ میں ،
عجب نہیں کہ ان سے بھی
ذلیل و خوار ہو کوی -

مگر زرا صدائے غیب آئےگی
شعور کو جھوئےگی—
شاعرانہ روح کو جگائےگی
کوی اٹھےگا اپنے من کی آنکھیں کھولتا ہوا
عقاب کے مثال شہپروں کو تولتا ہوا
زمانے بھر کی دل‌لگی
چبھےگی دل میں تیرسی
زبان آس پاس کی
لگےگی اس کو اجنبی -
وہ جن کو پوجتا ہے جگ ، بنا کے اپنا دیوتا ،
یہ خودپسند سر ان کے سامنے جھکے ، نہ جھک سکا -

---

* پوشکن نے یہاں اپالون (Аполлон) لکھا ہے جو '' اپالو '' دیوتا کا روسی تلفظ ہے ، یعنی نوروحیات کا دیوتا - روسی دیومالا میں اسے فنون‌لطیفہ کا دیوتا مانا گیا ہے ، جو ہندستان میں سرسوتی دیوی کا مقام ہے - (ظ - ا -)

وہ آپ اپنی ذات میں ہی محشر خیال ہے
خود اپنے زمزموں سے مالامال ہے ،
یہ روز کا چلن ، یہ بےحسی اسے وبال ہے
مزاج کا نہ اس سے میل ہے ، نہ اس سے تال ہے
وہ بےنیاز جا رہا ہے تیز گام — اس طرف
جہاں کنارے ہو چکے ہیں بےمقام — اس طرف
جہاں مچا ہے شور بن میں ڈھاک کے
جہاں لہربہر ہے خوش خرام — اس طرف

۱۸۲۷ء

اعمالنامہ

"ہماری آنکھ بھی شب بھر ستارہ بار رہی"
(اختر شیرانی)

جب نہ کانوں پہ ہو بار پرشور دن
شہر کے چوک گونگے ہوں، ہر چوک پر
جھلملاتی ہوں پرچھائیاں رات کی
نیند دن بھر کی محنت کا پائے ثمر
اس خموشی کا ہے جانلیوا چلن
وقت کٹتا نہیں، آنکھ لگتی نہیں
اونگھتے ٹھیلتے جسم میں، رات بھر
ٹیس اٹھتی ہے، ڈستے ہیں سانپوں کے پھن
ذہن پر یورشیں ہیں خیالات کی
خواب دہکے ہوئے، روح سلگی ہوئی
اور یادیں مرے سامنے بن کہے
کھول دیتی ہیں اعمالنامہ مرا

کسمساتا ہوں، بیزار ہوتا ہوں میں
غمزدہ آپ بیتی ہے پیش نظر
ہوں پشیمان، رہ رہ کے روتا ہوں میں
پر یہ تحریر آنسو سے دھلتی نہیں۔

۱۸۲۸ء

یادِ یار

دور کوئی رات‌بھر گاتا رہا
تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا
(جاں‌نثار اختر)

نہ سنا ، درد بھرے ، راگ سہانے نہ سنا
اے حسینہ ، یہ گروزینوں * کے گانے نہ سنا
تو جو گاتی ہے تو کیا دل پہ گزر جاتی ہے
دور ساحل کے شب‌وروز کی یاد آتی ہے

ہائے کیا گیت ہیں بےدرد کہ ڈھاتے ہیں ستم
پھر تصور میں ابھر آئے ہیں گزرے حالات
دور تک دشت میں پھیلی ہوئی وہ چاندنی رات
چاندنی میں کسی لڑکی کے بدن کا خم وچم

ہے کہیں راحت‌جاں ، دشمن جاں کا سایہ
بھول جاتا ہوں تجھے دیکھ کے اوروں کا وجود
آج تو نے جو وہی گیت لہک کر گایا
پھر گئی آنکھوں کے آگے اسی سائے کی نمود

نہ سنا ، درد بھرے ، راگ سہانے ، نہ سنا
اے حسینہ ، یہ گروزینوں کے گانے نہ سنا
تو جو گاتی ہے تو کیا دل پہ گزر جاتی ہے
دور ساحل کے شب‌وروز کی یاد آتی ہے

۱۸۲۸ء

---

* گروزین — قفقاز کے پہاڑی علاقوں میں بسنےوالے جارجیائی لوگ جنھیں روسی میں گروزین کہا جاتا ہے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

زہریلا ببول ۔ "انچار"

لو ، چلتی ہے ، خاک اڑتی ہے ، تپتی ہوئی ہر سانس
اک دشت ہے سوکھا ہوا ، پودا نہ کہیں گھانس
زہریلا ببول اس میں کھڑا ہے تن‌تنہا
سناٹے میں جیسے کسی جلاد کا پہرا

چٹخی ہوئی دھرتی نے کوئی طیش کا لمحہ
اس زہر بھرے تخم کے جننے کو چنا تھا
مرجھائی ہوئی ٹہنی میں پتہ نہ تری ہے
رگ رگ میں ہے اک بس کی لہر ، آگ بھری ہے

دوپہر کی گرمی سے دہک اٹھتی ہیں شاخیں
(جیسے کسی بھٹی سے نکل آئیں سلاخیں)
رستا ہے بہت چھال سے جب زہر ہلاہل
تب ، شام پڑے ، رال سے جم جاتے ہیں بکل

نزدیک بھی پر ماریں نہ دہشت سے پرندے
خود شیر بدکتا ہے ، لرزتے ہیں درندے
اس تک جو کہیں ، جھونک میں ، آجائے بگولہ
مسموم ہوا چاٹ کے بل کھائے بگولہ

بھولے سے جو بدلی کوئی شاخوں سے لپٹ جائے
ان اونگھتے پتوں کی اگر نیند اچٹ جائے
کڑوائی ہوئی آنکھوں میں بھر لاتے ہیں آنسو
سینے پہ جلی ریت کے ٹپکاتے ہیں آنسو

لیکن کسی اک شخص نے اک شخص کو گھورا
نظروں کا تقاضا تھا کہ فرمان ہو پورا
وہ حکم کا بندہ گیا انچار کی جانب
اور زہر لیے صبح کو سرکار کی جانب

جس سے کہ جگر ٹکڑے ہو، چھلنی ہو کلیجا
وہ گوند، وہ سرجھائی ہوئی شاخوں کا گٹھا
لےآیا مگر چھائی تھی اس چہرے پہ زردی
پھر سرد پسینے سے لگی زور کی سردی

وہ نذر تو لےآیا مگر درد کے مارے
چھپر کے تلے لیٹ گیا، پاؤں پسارے
سرکار کے چرنوں میں گرا، چھوڑ دیے پران
اک تن سے گئی جان تو اک تن کا بڑھا مان

حاکم نے اسی زہر میں تیر اپنے بجھا کر
بےچوک نشانہ لیا چلے میں چڑھا کر
سرحد کو چلے سوت کے اڑتے ہوئے پیغام
ہمسایوں کو چن‌چن کے دیے زہر بھرے جام

۱۸۲۸ء

حافظ شیرازی کے رنگ میں

(لب فرات کے کیمپ میں لکھی گئی)

اسیر دام شہرت ہو نہ جانا
جوان خوبرو زیں جا کرانہ ! *
یہاں ہنگامۂ پیکار ہے گرم
میان خاک‌وخوں آتش زبانہ
خبردار ایسے خونی معرکوں میں
قراباشوں کی صف ہے باغیانہ ۔
یقیناً موت کترائےگی تم سے
نہ عزرائیل تاکےگا نشانہ
جھکا لےگی نظر خود برق‌شمشیر
تمہارا حسن ہے وہ ساحرانہ
مگر اس جنگ میں کم ہو نہ جائے
یہ شائستہ ادائے دلبرانہ
نہیں ممکن فضائے کشت‌وخوں میں
نیازوناز و خوشباشی بچانا

۱۸۲۹ ء

---

* پوشکن نے ایسے ایک نوجوان کو خطاب کیا ہے جس نے درایائے فرات کے کنارے کے جنگی معرکوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا ۔ حافظ شیرازی نے بھی ایک غزل میں اپنے محبوب کو اسی قسم کی تنبیہ کی تھی ؛ ہم نے حافظ کی بحر سے کام لیا ہے :

خدارا کم نشیں باخرقہ پوشاں ۔
تو نازک طبعی‌وطاقت نیاری
گرانی ہائے مشت دلق پوشاں ۔

ملاحظہ ہو Хафиз. 50 газелей. Проф. И. Брагинский. Сталинабад. 1955г. (ظ ۔ ا ۔)

جاڑوں کی ایک صبح

پالا کٹتا ہے ، دھوپ بھری
اور روشنی پھیلی ہے دن کی
تم ، جان ، جہاں ، کیا سوتی ہو ؟ اٹھ جاؤ یہ منظر دیکھو تو
اے حسن کی دیوی ، مل ڈالو اب نیند کی ماتی انکھیوں کو
اتر سے اجالا آتا ہے
دن کیا متوالا آتا ہے !
اس دن کا سواگت کرنے کو ، تم صبح کا تارا بن جاؤ

کل رات بڑا طوفان رہا
کچھ یاد ہے ، کیا طوفان رہا
برفیلے بگولے دھرتی سے آکاش کو بڑھتے جاتے تھے
تھی چاند کی ٹکیا سہمی سی ، بادل سر چڑھتے جاتے تھے
وہ کل کی اداسی دور ہوئی
تھا جس سے تمھارا من میلا ، وہ رات گئی ، کافور ہوئی

اب نیلے گنبد کے نیچے
پھیلے ہیں برف کے غالیچے
کیا شان دکھاتے ہیں دن میں ، کیا دھوپ میں چم‌چم کرتے ہیں
اس اجلے ستھرے منظر میں شفافسا جنگل بکھرا ہے
پالے کی ہلکی چھینٹوں سے دیودار کا سبزہ نکھرا ہے
اور پتھر جیسے برف تلے دھارے بھی نرم گزرتے ہیں
کمرے میں روپہلی دھوپ لئے
دن آیا اجلا روپ لئے
چولھے میں بھرے ہوں انگارے اور چٹ‌چٹ اڑتی چنگاری
بستر پر پڑے ہوں سوچ میں گم، تب لطف ہے موسم کا پیاری

پر آؤ ، زرا جی بہلا لیں
مشکی پر ساز کسا جائے
بے‌پہیے کی گاڑی میں ہم تم سیر کریں ، پھسلا جائے

اس برف میں پھسلن زور کی ہے
بوباس ہوا میں بھور کی ہے
بےتاب ہے گھوڑا اڑنے کو ، فراٹے بھرتے جائیں‌گے
اے جان ، یہ صبحیں عیش کی ہیں، ہم عیش ہی کرتے جائیں‌گے

خالی کھیتوں ، میدانوں سے
جنگل سے اور ویرانوں سے
ہیں تجھ کو بہت پیارے ساحل ، ساحل سے گزرتے جائیں‌گے

۱۸۲۹ء

میں نے چاہا تھا تمہیں

میں نے چاہا تھا تمھیں ، تم سے محبت کی تھی
کیا خبر ، آج بھی ہو دل میں دبی چنگاری

خیر ، اب آنچ میں کیوں اس کی جلاؤں تم کو ؛
جی نہیں مانتا ، کچھ ٹھیس لگاؤں تم کو ،
دل دکھے جس سے وہی بات سناؤں تم کو !

تھی محبت میں گلے کی ، نہ صلے کی پروا
بےزبانی سے ، کبھی رشک سے دل ٹکڑے تھا

جس نزاکت سے ، لگن سے تمھیں چاہا میں نے
یوں ہی پھر چاہے کوئی اور بھی — اللہ کرے !

۱۸۲۹ء

ٹھکانا ہو کہیں میرا

"میں اور اندیشہ‌ہائے دورودراز"
(غالب)

کبھی سڑکوں کے شوروشر میں، ہنگاموں میں آوارہ
کبھی میں اور عبادت‌گاہ کے مجمع کا نظارہ
کبھی جا بیٹھتا ہوں سر پھرے ان نوجوانوں میں
مگر میں اپنی ہی دھن میں ہوں، گم اپنے گمانوں میں

کبھی کہتا ہوں: ماہ و سال بہہ جاتے ہیں پانی سے
بچھڑکر دوستوں سے کس قدر لاچار بیٹھے ہیں
گزرنا ہے ہمیں بھی اس کمان جاودانی سے
"بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں" *

یہ برگد، دیکھتی ہیں جس کو مجھ ناشاد کی آنکھیں
تن‌تنہا، درختوں کے کٹم کا مورث اعلا
یہ میرے عہد رفتہ کا تماشا دیکھنےوالا
اسی برگد نے دیکھی ہیں مرے اجداد کی آنکھیں

کبھی جو پھول سے بچے کو لےلوں، گود پھیلائے
خیال آتا ہے، کہدوں: لے مبارک تجھ کو یہ کیاری
یہ جلوہ اب ترے حصے کا ہے، ہم بھر چکے باری
چمن میں میرے مرجھانے، ترے کھلنے کے دن آئے

کبھی میں سوچتا ہوں: موت برحق ہے، مقدر ہے
سحر سے شام ہوتی ہے، گزر جاتا ہے یوں دن بھر
اسی اک فکر میں ڈوبا ہوا رہتا ہوں میں اکثر
ذرا دیکھیں تو کس دن، کونسا لمحہ مقرر ہے!

---

* انشا کی مشہور غزل کا مصرعہ ہے۔ (ظ۔ ا۔)

نجانے کس جگہ میرا اجل کا سامنا ہوگا
کہیں میدان میں ، لہروں میں یا گھمسان کے رن میں ؟
بھلا کیا جانیے ، نزدیک ہی وادی کے دامن میں
اجل کو سرد خاکستر کا دامن تھامنا ہوگا ؟

غبار راہ کو کیا ہے ، ٹھکانا ہو کہیں میرا
ہوا جب جسم بےجاں ، کوئی مٹی ہو ، کوئی نگری
مگر اک آرزو تھی ، مجھ کو پیاری ہے مری نگری
جب آنکھیں بند ہوجائیں ، سرھانا ہو یہیں میرا

سرھانے زندگی کچھ گل کھلائے ، رنگ بھرجائے
زمیں بےمہر فطرت سبز کردے ، ڈال دے بیلیں
جوانوں کے پرے گھوما کریں ، بچے یہاں کھیلیں
ہمیشہ مسکرائے حسن اور مٹی سنور جائے ۔

۱۸۲۹ ء

جاؤ کاہے کو جھوٹی بناؤ بتیاں

ایک سانچے میں ڈھلا اور سڈول
جب میں آغوش میں بھرتا ہوں تمہارا یہ بدن
پیار کے نرم دلاویز سے بول
خودبخود تم کو سنا دیتے ہیں اس دل کی لگن ۔
تم سنی انسنی کرنےوالی
ڈھیلے ہاتھوں سے چھڑاتی ہو لچکتی ڈالی ؛
لب پہ آتی ہے کٹیلی مسکان
ایسی مسکان جو کہتی ہے کہ جھوٹے ہو سجن ؛
یاد میں سینت کے رکھے ہو پرانی باتیں
بےوفائی کی وہ سچ جھوٹ کہانی باتیں
نہ لگاوٹ ، نہ توجہ ، نہ جواب
بےرخی کی یہ ادا ، روپ کا یہ روکھاپن
کتنے پرکار تھے کمبخت ، انھیں آگ لگے
اس خطاوار جوانی کے تھے ایسے لچھن !
باغ میں ، رات کے سناٹوں میں
وہ ملاقات کے حیلے ، وہ کسی کے درشن
کچے کانوں میں کبھی پریم کے منتر پھونکے
رازداری سے کہیں شعر بھی پڑھ کر پھونکے
کتنے عیار تھے ، غارت ہوں وہ الفت کے جتن
پہلے تو لاڈ ، پھر آنسو کی جھڑی ، پھر انبن

۱۸۳۰ ء

شاعر سے خطاب

"آسان نبود ، کشاکش پاس قبول *
زنہار نگردی بہ نکوئی بدنام"
(غالب)

شاعر ! قبول عام کو سینے سے مت لگا
ہے واہوا کا شور صدائے گریز پا ؛
سن بے تہوں کے فیصلے ، مجمع کے قہقہے
لیکن تو اس مقام پہ ثابت قدم رہے !

تو بادشاہ وقت ہے ، جی اپنی زندگی
آزادی رہنما ہے ترے عقل و ہوش کی
بخشے گئے ہیں تجھ کو خیالات کے ثمر
کر پختہ ان کو اور صلہ کچھ طلب نہ کر

کھوٹے کھرے کا فیصلہ خود تیرے ہاتھ میں ؛
اپنے ہنر کی جانچ میں ہے کون سخت گیر
تیرے سوا ؟ جو رنگ بھرے کائنات میں

تو مطمئن ہے ؟ خیر ہو نامطمئن ہجوم ،
ناپاک ہو نہ جائےگی تھوکے سے ان کے آگ ؛
تیری تپائی اور بھی ناچےگی گھوم گھوم **

۱۸۳۰ ء

---

* مقدس آگ جو گوشہ عبادت (Altar) میں روشن ہوتی ہے ، تپائی کا لفظ ، اسی آگ کی نسبت سے آیا ہے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

** ترجمہ : عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کےلئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں ؛ سب لوگ تمھیں اچھا کہیں خوش رہیں ، یہ بدنامی ہرگز اختیار نہ کرنا ۔ (ظ ۔ ا ۔)

"میدونا"، حسن کا پیکر

کبھی تمنا نہ تھی کہ میں اپنا گھر سجالوں
پرانے وقتوں کے شاھکاروں کو جن کے دیوار و در سجالوں
جو آئے تکتا رہے وہ پہروں ، بڑی توجہ سے دیکھے بھالے
کہ جیسے اھل نظر ھمی ھیں پرکھنےوالے

یہ آرزو تھی کہ میرے گھر میں ، جہاں مشقت ھے ریشہ ریشہ
بس ایک تصویر روبرو ھو ، اسی کو دیکھا کروں ھمیشہ :
شبیہہ دوشیزہ حسن مریم ، مسیح پاکیزہ ابن مریم
نگاہ ایسے اٹھے کہ رنگوں کے پیرھن میں نہیں — وہ بادل میں ھیں مجسم

وہ دونوں قدسی صفات چہرے ، کیے ھوئے نور ان کا ھالہ
جبیں پہ عظمت ، نظر میں معصومیت کا جلوہ
نہ ھو ملائک کا دخل ، نخل " زیون " * کے سائے میں ھوں وہ تنہا

مراد برآئی دل کی — پروردگار نے تجھ کو میری خاطر
زمیں پر نازل کیا ، سنوارا یہ روپ دیکر مری " میدونا " :
لطافت و دلکشی کا پیکر ، نفاست و حسن کا نمونہ

۱۸۳۰ء

---

* زیون Zion — یروشلم کی وہ مقدس پہاڑی ، جہاں اعتقاد کے مطابق خدا کا گھر ھے ۔ حضرت عیسی کے بچپن کی تصویروں میں زیون کی پہاڑی پر کھجور کا درخت دکھایا جاتا ھے ۔ (ایڈیٹر)

شامِ زندگی

اب نہ وہ دور جنوں ہے ، نہ وہ محفل کی بہار
بوجھ سینے پہ ہے میرے ، شب‌رفتہ کا خمار
روح میں ہے غم ایام بھی صہبا کی نظیر
جس قدر رو کیے بڑھتی ہے نشے کی تاثیر
راہ دشوار ہے میری ، غم و محنت کا عمل
اک پرآشوب سمندر ہے ، مچی ہے ہلچل

موت کیا چاھوں کہ جینے کے ہیں ارمان مجھے
ربط ہے فکر سے بھی ، غم کا بھی عرفان مجھے
اپنے افکار میں ، دنیا کے ستم سہنے میں
زیست کا لطف رہے شعلہ بجاں رہنے میں ؛
کبھی آواز کی لہروں میں ملے دل کو سرور
اور کبھی یوں ہی کسی بات پہ اشکوں کا وفور
کیا خبر ، جب ہو مری عمر کی ڈھلتی ہوئی شام
عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام

۱۸۳۰ء

نیند جب نہیں آتی

ہے کہاں روشنی ؟ نیند کو کیا ہوا ؟
ہر طرف کچھ اندھیرا سا پھیلا ہوا ؛
ایک آواز میں ، ایک ہی تال پر
میرے پہلو سے ٹک‌ٹک گھڑی کی صدا ۔
ہر طرف سانس روکے ہوئے بام و در ؛
پارک میں عورتیں اونگھتی ٹہلتی
باتیں کرتی چلی جائیں‌گی اپنے گھر ۔
زندگی سرسراتی سی چوہیا ہے تو ...
کیوں ستاتی ہے مجھ کو ، ارادہ ہے کیا ؟
دن جو بیتا ، یہ اس کی کھٹک تو نہیں ؟
ہو شکایت نہ سرگوشیوں میں کہیں ؟
مجھ سے کس بات کا ہے تقاضا ؟ بتا ۔
پیشگوئی ہے یا بس ، پکارا مجھے
سوچتا ہوں ، پہ کھلتا نہیں ماجرا
راز ہے رات کا یہ اشارا مجھے ...

۱۸۳۰ء

صدائے بازگشت

درندے دہاڑیں کہیں جنگلوں میں
بجیں سنکھ یا ہو کڑک بادلوں میں
اگر ٹیکری کے پرے ، کنیا گا رہی ہو کوئی
کسی لے میں بھی فاصلے سے صدا آرہی ہو کوئی
ہر آواز پر ہے تجھے اضطراب
ہوا میں اچھالے گا اس کا جواب

دھماکے ، گرج ، موج ، طوفان کی ہاؤ ہو
بڑے دھیان سے آہٹیں سب کی سنتا ہے تو
گڈریا پکارے جو کھیتوں کے پار
اسے بھی ملے گی جوابی پکار
نہیں ہے مگر کوئی تیری صدا کا جواب
ارے شاعر لاجواب !

۱۸۳۱ء

حُسنِ جواں

نہیں ، نہیں ، یہ نہیں تاب ، یہ مجال مجھے
کہ موجِ عشق کو دیوانہ‌وار اپنالوں
سکونِ‌دل کا ہے اب اس قدر خیال مجھے
نہ بیخودی کی تمنا کروں ، نہ غم پالوں

گزر چکے ہیں محبت کے دن؛ مگر پھر بھی
ڈھلا ہو نور کے سانچے میں کوئی مست شباب
بدن چرا کے چلے، ڈال‌دے نظر پھر بھی ،
تو کیوں نہ ہو مرے سینے میں آرزو بےتاب ؟

روا نہیں نہ سہی؛ میں کسی کے قدموں میں
نگاہ شوق بچھادوں غم‌نشاط کے ساتھ
جدھر وہ جائے، نگاہیں بھی آس‌پاس رہیں،
دعا یہ دوں کہ مرادیں ملیں حیات کے ساتھ

زمانہ راحت و عیش دوام دے اس کو
وہ دلنواز کسی دل کا انتخاب کرے
جو عمر بھر کی رفاقت کا جام دے اس کو
خوشی نصیب ہو، تقدیر کامیاب کرے

۱۸۳۲ء

شہروں کے ہنگاموں سے دُور

چلو، مرے عزیز، وقت ہے، نکل چلیں! ہے دل کو عافیت کی جستجو
دنوں پہ دن اڑے چلے؛ ہر اک پہر، ہر اک گھڑی
اٹھا کے لے چلی مرے ترے وجود کی کڑی کڑی
نہیں ہے موت سے مفر، مگر ہمیں بہت ہے زندگی کی آرزو -

خوشی کہاں زمین پر، کچھ اپنا اختیار، کچھ سکوں سہی
تھکے ہوئے غلام کو یہ فکر ہے، جو یوں نہیں تو یوں سہی :
اٹھاکے اپنا بار اس طرف کہیں فرار ہو
جہاں لگن ہو کام کی، وجود کو قرار ہو

۱۸۳۴ء

بادل

لیلائے آب‌ورنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں، سویرا قریب ہے
(جوش)

آخری بادل ہے تو، گزرے ہوئے طوفان کا
تو گزر جائے تو مطلع صاف ہو، نکھرے فضا
اک اکیلا دل گرفتہ سائے پھیلاتا ہے تو،
اپنے دم سے اس خوشی کے دن کو گہناتا ہے تو

ڈھک لیا تھا آسماں کو تونے چاروں اور سے
اور شکنجے میں تجھے کستی تھی بجلی زور سے
تو جو غصے سے گرجتا تھا زمیں پر باربار
ٹوٹ کر برسا، بجھائی تشنگی، نکلا غبار

بس بہت دکھلا چکا دم خم، زمانہ لد گیا
اب زمیں تازہ ہوئی، طوفان شدومد گیا
بن سنورکر پتیاں نکلی ہیں، جھونکے آئیں گے
ان کا منھ چومیں گے اور تجھ کو ہوا بتلائیں گے

۱۸۳۵ء

زندہ یادگار

میں زمانے کو دیے جاتا ہوں ایسی یادگار
دستکاری کے نمونوں میں نہیں جس کا شمار
سبزۂ بیگانہ جس کی راہ میں اگنے نہ پائے
جس کے آگے قصر شاہی کا منارہ سر جھکائے

میری ہستی کو بھلا کیا موت کر سکتی ہے پست
'' کوکبم را درعدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن ،، *
چاندنی میں سانس لے جب تک کسی شاعر کا فن

سرزمین روس میں پھیلے گا اک دن میرا نام
ملک کی ساری زبانوں پر رواں ہوگا کلام
'' فن ،، ہوں یا صحرانشیں '' قلمیق ،، یا '' تنگس ،، غریب
یا '' سلاف ،، اسلاف کے خوددار بیٹے خوش نصیب

یاد رکھیں گے محبت سے کہ تھا اک نے نواز
جس نے اکسایا شرافت کو ، جگایا سوز و ساز
میں نے اس کلجگ میں کھل کر گائے آزادی کے گن
تھی مجھے مجبور انسانوں سے ہمدردی کی دھن

سن ، مری جان سخن ، فرمان یزداں سن سدا
داد کی تجھ کو تمنا ہو ، نہ ڈر بیداد کا
مت الجھ نادان سے ، نافہم کو مت کر قبول
نیک نامی کیا ہے ، بدنامی ہے کیا ، دونوں فضول

۱۸۳۶ ء

---

* غالب نے ۱۸۴۰ ء کے قریب یہ فارسی قطعہ اپنے بارے میں کہا تھا : '' جب میں اس دنیا میں نہ رہوں گا تو میرا ستارہ چمکے گا اور میرے کلام کی شہرت پھیل جائے گی ۔ ،، (ظ ۔ ا ۔)

طویل نظمیں

قفقاز کا قیدی

پہلا حصہ

یہ گاؤں چرکسوں * کا ہے ، یہاں لوگ
کیے بیٹھے ہیں دھلیزوں پہ سنجوگ
یہ ہیں قفقاز کے بیٹے ، زبانیں
سناتی ہیں پرانی داستانیں
وہ جنگیں ، جانلیوا اور خوں‌ریز
وہ گھوڑے خوبصورت ، تیز طرار
مزے کے دن ، وہ جنگی‌پن کی بھرمار
وہ حملے بےمحابا ، ترکتازی
وہ سرداروں کے دھوکے ، چالبازی
وہ ان کی بےپنہ شمشیر کے وار
نشانہ بےخطا اور تیر پرکار
وہ گاؤں ، جن کو پھونکا ، کر دیا راکھ
وہ کالی انکھڑیاں ، قیدی طرحدار

ادھر باتیں چلی ہیں ، رات ہے شانت
ادھر ہے چاند اور کہرے میں ایکانت
نظر یکدم جو اٹھی سب کی ناگاہ
ہوا گھوڑے پہ اک چرکس نمودار
کوئی قیدی گھسیٹے نوگرفتار
" یہ روسی ہے ، یہ لو ،، جھلا کے بولا ؛
سنی آواز تو سب گاؤں ٹولا
لپک کر آگیا اور اٹ گئی راہ

---

* چرکس ، کوہقاف کے علاقوں میں پھیلا ہوا وہ سرکش قبیلہ جسے عرب مورخوں نے سرخس لکھا ہے ۔ مصر اور سیریا (شام) میں انھیں اعلا فوجی منصب ملتے رہے ہیں ۔ (ظ ۔ ا ۔)

جسے دیکھو وہی آفت مچائے
مگر اس شور میں قیدی ہے گم‌سم
یہ ہنگامہ سمجھ میں کچھ نہ آئے
بگڑتے چہرے ، غصہ، ڈانٹ پھٹکار
گرفتار بلا کو کیا سروکار !
جوانی میں یہ حالت موت کی سی
پسینہ سرد ، سانس اکھڑی ہوئی سی

یہاں سب طیش میں ، ہر شخص کو جوش
مگر قیدی پڑا تھا نیم بےہوش
چڑھی جب دھوپ سر پر دوپہر کی
تو آنکھیں کھل گئیں اس بےخبر کی
لبوں پر آہ اور چہرے پہ وحشت
بدن میں دھوپ سے کچھ کچھ حرارت
سنبھالا ہوش ، کوشش کی کہ جاگے
اندھیرا آ گیا آنکھوں کے آگے
اٹھا آہستہ آہستہ تو دیکھا
پہاڑوں کا بچھا ہے جال ہر سمت
چٹانیں سر اٹھائے گھورتی ہیں
ہے چرکس سرکشوں کا آشیانہ
ڈکیتوں کے قبیلوں کا ٹھکانا
بھیانک خواب سا ظاہر ہوا یوں :
کہ اب ان ظالموں کی قید میں ہوں
ہلے پاؤں تو زنجیروں کی جھنکار
اٹھی اور کر گئی اس کو خبردار
وہ دہشت‌ناک تھی آواز سچ‌مچ
کہ روشن ہوگیا احوال سب کچھ
گہن میں آ گیا فطرت کا منظر
غلامی میں بسر ہوگی یہاں پر
وداع — اب تجھ کو آزادی کی دیوی !
احاطے کی ہے اک دیوار پرخار

پس دیوار بے یار و مددگار
نہ چرکس ہے ، نہ کوئی پاسباں ہے
گئے سب کھیت پر ، تنہا یہاں ہے
ہرے ، ہموار اور سنسان صحرا
جدھر دیکھو ، پہاڑوں کی چڑھائی
نکلتی چوٹیاں ، ڈھلتی ترائی
انھی یک رنگیوں میں ایک رستہ
یہاں سے فاصلوں پر رینگتا ہے
اسے تکتے ہی قیدی دلشکستہ
خیالوں میں کہیں گم ہوگیا ہے

یہی ہے روس کی ، اس دیس کی راہ
جہاں شعلوں سے کھیلی نوجوانی
نہ غم پالا ، نہ کوئی بات مانی
جہاں پہلی خوشی سے کی ملاقات
جہاں چاہا بہت ، پائی بہت چاہ
جہاں آغوش میں طوفان بھینچے
خطر سے زندگی کے کھیت سینچے
جہاں کیں آرزوئیں ، کامنائیں
وہ اچھے دن بھی آتے ہیں کبھی یاد
دل خستہ ہے اب تک ان سے آباد

کھلی جب اس پہ لوگوں کی حقیقت
نکمی زندگی کی قدر و قیمت
عزیزوں دوستوں کی بےوفائی
محبت کی لگن — خواب پریشاں
نہ ہنگامہ ، نہ محفل راس آئی
جہاں ناحق وہ خود ہوتا تھا قربان
کٹیلی تہمتیں اور دورخاپن
وہ نا سمجھی کے چھینٹے ، جگ ہنسائی
تکلف برطرف ، فطرت کا شیدا

وطن کو چھوڑ کر نکلا جو تنہا
تو آزادی نے اپنی چھب دکھائی
اسے یوں بے ٹھکانے کھینچ لائی۔

تو آزادی کہاں ہے روپ دکھلا !
بہت کی جستجو سنسان بن میں
بہت ویرانیوں کی خاک چھانی
نہ حسرت ہے ، نہ اب خواب جوانی
پڑی ہے آتما تیرے بھجن میں
بسالی تیری مورت تن بدن میں

سفر بس ختم ... سوجھے گا یہاں کیا
نہیں دنیا میں امیدوں کی منزل
کہاں چھپتا ہے او خواب جوانی !
غلامی کے حوالے کر گیا ، آہ !
کسی پتھر پہ اپنا سر جھکائے
یہ قیدی دیکھتا ہے قبر کی راہ
کہ جب لمبے ہوں شام غم کے سائے
بھڑک کر گل ہو شمع زندگانی

پہاڑوں کے پرے اترا ہے سورج
مچا ہے شور غل کچھ فاصلے پر
چلے کھیتوں سے گھر کو گاؤں والے
چمکتی دھار کے ہسیے سنبھالے
وہ آپہنچے—جلے ہیں دیپ مدھم
اجالا گھر میں ، باہر شور کچھ کم
بچھی ہے رات کی میلی سی چادر
اسی میں چین مل جاتا ہے تھک کر
مچلتے ہیں پہاڑی سوت چم چم
بھٹکتے پھر رہے ہیں پتھروں میں۔
جب اونچی چوٹیوں کو نیند آئی

تو اوڑھی سب نے بادل کی رضائی
یہ قفقاز اور اس کی چاندنی رات
بڑا گمبھیر سناٹا گھروں میں ۔
دبے قدموں چلا آتا ہے یہ کون ؟
ٹھٹھک کر آنکھ جو روسی نے کھولی
تو دیکھا کیا کہ اک نوخیز چرکس
کیا آداب ، منھ سے کچھ نہ بولی
نظر چہرے پہ ڈالی ، دل میں سوچا
عجب یہ ماجرا ہے خواب کا سا
تھکے ارمان پھر جل دے رہے ہیں ۔
(کدھر یہ ٹوٹی کشتی کھے رہے ہیں ؟)
نہائی چاندنی میں نوجوانی
تبسم میں بسی تھی مہربانی
جھکی زانو پہ اور ''کوبس،، * سنبھالا
خنک شربت تھا ، راحت دینےوالا
لگایا اس کے ہونٹوں سے پیالا
مگر وہ بھول بیٹھا جام صحت
کہے دیتی تھی بےچینی کی حالت :
اسی دیدار کی پیاسی تھیں آنکھیں
یہی جادو بھری گفتار شربت
وہ بولی اجنبی کی کیا سمجھتا
مگر تار نظر میں روح کا راز
نزاکت میں تلی تھی اس کی آواز ۔
کہا قیدی سے ''جی،، اور جی گیا وہ
بدن میں کچھ سکت باقی رہی تھی
سو اس کے حکم کی تعمیل کردی
شفا کا جام لے کر ، پی گیا وہ
وہی پتھر ، وہیں وہ سرنگوں پھر

---

* کوبس — گھوڑی کے دودھ کا شربت جو پہاڑی اور ایشیائی قبیلوں میں شوق سے پیا جاتا ہے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

پلٹ آیا نہ ہو اس کا جنون پھر !
کہیں کھایا نہ ہو چرکس کا چرکا
وہی مرکز ہے افسردہ نظر کا۔
وہ خود چپ‌چاپ بیٹھی ، سوچ میں گم
کہ قیدی اجنبی ہے اور گم‌سم
زبان غیر میں تقریر کیا ہو !
اسے بہلاؤں ، پر تدبیر کیا ہو !
لبوں تک آکے رہ جاتی ہے گفتار
نظر آتے ہیں ہلتے ہونٹ ہر بار
نہ آہ سرد کام آئے ، نہ آنسو
نہ ہے اس بےبسی میں دل پہ قابو

گئے دن جیسے ڈھلتی دھوپ جائے
پہاڑوں میں لیے پھرتا ہے گلہ
پڑا ہے پاؤں میں بیڑی کا چھلا
اگر چلتی ہے لو ، جلتے ہیں پتھر
گپھا ٹھنڈک میں ہے آرام کا گھر
اندھیرے میں نکل آتا ہے جس دم
پہاڑوں کے سروں پر چاند کا سینگ
وہ چرکس دور پگڈنڈی پہ کچھ رینگ
سرکتی ، سائے میں کھاتی ہوئی خم
لیے آتی ہے خوشبودار جل‌پان
شراب و شہد و ''کومیس'' گندمی نان
اسی کے ساتھ یوں چھپ چھپ کے کھانا
زباں سے کچھ نہ کہنا ، تکتے جانا
جھکی نظریں ، اشارے اور مدارات
کہیں کیا ، ہے بڑی الجھی ہوئی بات
سناتی ہے پہاڑی گیت ، انمول
پرانے قصے ، یادیں ، ویرگا تھا
گروزینی زباں کے اجنبی بول
امنگیں ہیں ابھی دوشیزگی کی

یہ پہلا پیار ، پہلی خوش‌نصیبی
مگر روسی کو اپنی نوجوانی
لٹائے اک زمانہ ہو چکا ہے
وہ جذبوں کی حرارت کھو چکا ہے ؛
جواب اس چاہ کا دیتا نہیں دل
محبت ہو چکی خواب فراموش
کہاں ان بندھنوں میں عشق کا ہوش
کھلے بندوں نہ پھنس جائے کہیں دل !

نہیں بجھتیں جوانی کی امنگیں
نہ چھوٹی ہیں ، نہ چھوٹیں‌گی ترنگیں
اچانک جب بھی مل جاتا ہے سنتوش
بسا لیتے‌ہیں ہم ہر بار آغوش
مگر اے پہلی الفت کی دکھی سانس
چبھے جاتی ہے سینے میں تری پھانس
مقدس نشہ ، یادوں کا تلازم
پلٹ‌کر پھر کبھی آتے نہیں تم

وہ قیدی نامراد اس زندگی کا
ہوا جاتا تھا عادی رفتہ رفتہ
غلامی کی کسک ، سینے کے شعلے
بسے جاتے تھے دل میں ہولے ہولے
سویرے صبح کی ٹھنڈی ہوا میں
بلاتی تھیں اسے روکھی چٹانیں
پھرا کرتا تھا ان میں پا بہ‌زنجیر
بچھا تھا دور تک کہسار کا جال
کہیں گورا ، کہیں نیلا ، کہیں لال
بنی تھی ایک عالی‌شان تصویر
امر ہے برف کی یہ راجدھانی
نظر آتا ہے یوں کہسار منڈل
بندھے ہوں جیسے زنجیروں میں بادل ۔

اسی کنڈل میں ہے اک دوہری بالی
دمکتا برف سر پر — تاج‌والی
مہا پربت، عظیم‌الشان البرز
ہے چرخ نیلگوں پر دودھیا گرز
گرجتی جب فضا طوفاں سے پہلے
قیامت کی گرج ، کہسار دہلے
تو قیدی بھی کہیں گاؤں کے اوپر
پہاڑوں میں اٹک جاتا تھا اکثر
دھواں بادل اڑاتے پاؤں کے پاس
بگولے بن کے پھرتی خاک اور گھاس
لگی ہوتی یہ بارہ سنگھے کو ٹوہ
سمائیں سینگ ، مل جائے کہیں کھوہ
عقاب اٹھتے ، پروں کو پھڑپھڑاتے
ہوا میں چیختے ، سیٹی بجاتے
مچاتے شور چوپایوں کے ریوڑ
دبالیتا ان آوازوں کو جھکڑ
کہیں بجلی کڑک جاتی بہت دور
ٹپکتا اولہ پانی مثل کافور
پہاڑی نالیاں چلتی تھیں بھل بھل
لڑھک جاتے تھے پتھر ان کی رو میں
تلاطم موج کا ، دم بھر میں جل تھل
پہاڑوں کی بلندی سے وہ تنہا
یہ دہشتناک منظر دیکھتا تھا
بجایا تو بہت طوفان نے گھن
گھٹا بکھرے ، اٹھے سورج کی چلمن
اسی کا منتظر رہتا تھا قیدی
ہوا کرتی تھی دل میں گدگدی سی

نرالے لوگ تھے یہ ، ان کی جانب
کھنچا جاتا تھا دل اس یورپی کا
پہاڑی زندگی ، سیدھا طریقہ

عقیدے ، ریت رسمیں ، طور اطوار
وہ ان کی سادگی ، مہماں نوازی
ذرا سی بات پر شمشیر بازی
وہ پھرتیلے بدن ، لچکیلی رفتار
قدم ہلکے ، نہایت ٹھوس بازو
تماشائی کی نظریں تھیں ترازو
وہ پہروں دیکھتا تھا ، کیسے چرکس
اڑے پھرتے ہیں تیزی سے کمرکس
لبادہ اون کا ، بالوں کی ٹوپی
رکابوں میں قدم ، خمدار کاٹھی
ڈھلانوں اور میدانوں میں دن رات
جدھر جی چاہتا ، گھوڑے کداتے
محاذجنگ کے کرتب سکھاتے
اسے بھاتی تھی یہ پوشاک جس میں
نہ تھیں معمول یا وردی کی قسمیں
سجے ہتھیار چرکس کے بدن پر
وہ اتراتا ہے اپنے بانکپن پر
کماں ، خنجر ، کمند و تیر و ترکش
زرہ ، تلوار ، توڑےدار بندوق
یہی دکھ سکھ کے ساتھی ، یار معشوق
کشادہ اس کی پیشانی ، کھلا دل
نہ دبنے کا ، نہ گھبرانے کا قائل
سواری پر ہو یا گھوبے پیادہ
وہی چرکس ، وہی حلیہ ہے سادہ
اٹل فطرت ہے اور خودسر ارادہ ۔
نڈر قزاق * ، ہمسائے خطرناک

---

* قزاق کو اصل میں Cossack یا کزاک لکھا جاتا ہے ۔ روس کے وہ غریب کسان جو لگان ادا نہ کرنے یا کسی اور جرم میں روس سے فرار ہوکر سرحدی علاقوں ، خصوصاً یوکرین میں جابسے ، جہاں دریائے دون کے ساحلوں پر چرکسوں ، تاتاریوں اور ترکوں سے ان کی

بڑی دولت ہے لیکن اسپ چالاک
پہاڑی نسل کے یہ چست گھوڑے
وفادار ، آزمودہ‌کار ، بےباک
بڑے ہشیار ہیں ، مالک کو لے کر
دبکتے ہیں گپھا میں ، گھوربن میں
مسافر کی جھلک ملتے ہی باہر
سٹک کر تیر سے بس دم زدن میں
نشانے پر پہنچتے ہیں دھواں دھار -
یہ حملہ ہے بلائے ناگہانی
گزر جاتا ہے سر سے اس کا پانی
کمند اڑتی ہے ، پھنس جاتے ہیں ہتھیار -
اڑا جاتا ہے گھوڑا منہ اٹھائے
شکار ناتواں پیچھے لگائے
کھلی ہے راہ ، جھاڑی ہو کہ جنگل
چٹانیں ، گھاٹیاں ، درے کہ دلدل
قدم کے ساتھ پڑتی خون کی چھاپ
تلیٹی میں ٹپاٹپ گونجتی ٹاپ
چھچھلتا سامنے پانی کا دھارا
سمٹ کر جب وہ بھرتا ہے ترارا
سنبھل پاتا نہیں بےبس مسافر
گلے تک آگئی ہے موج آخر
جھلک دکھلا کے رخصت ہو گئی موت ...
نہ مرنے کا ، نہ ہے جینے کا یارا
لگائی اس کو لے کر تیر سی جست
کنارے آلیا گھوڑا زبردست

جنگ رہتی تھی- ۱۸ویں صدی سے انقلاب ۱۹۱۷ء تک ان کو فوجی امتیاز دیا جانے لگا- کوبان ، تیریک اور دون کے ساحلوں پر ان کی بستیاں آج تک موجود ہیں- زاپروژیے ان کا سیاسی مرکز تھا- (ظ- ا-)

اماوس کی اندھیری رات آکر
اڑھا دیتی ھے جب ٹیلوں کو چادر
تو چرکس بےخطر دریا کے رخ پر
بہا جاتا ھے اک کندا سنبھالے
کنارے ھیں یہ اس کے دیکھے بھالے
پرانے پیڑ کی شاخیں جھکا کر
بنالیتا ھے ان کی الگنی سی
کہ اس پر اپنے سب ھتھیار ڈالے
کمان و تیر و ترکش، خود و جوشن
لبادہ اور سپر لٹکا کے فورن
لگا دیتا ھے جب چپ چاپ غوطہ
تو موجوں سے نہیں کچھ خوف ھوتا
ھے گھری رات ، دریا ھونکتا ھے
مگر چرکس تلاطم پر چلا ھے
بڑی سنسان ھے ساحل کی خلوت
کگاروں پر ، کہیں ٹیلوں پہ قزاق
کیے نیزوں پہ تکیہ ، محو غفلت
تکا کرتے ھیں دریا کی روانی
برابر سے جہاں گدلا ھے پانی
سٹک جاتے ھیں یہ ھتھیار بدذات
ارے قزاق ، ھو کس سوچ میں گم ؟
کسی پچھلی لڑائی کے خیالات ؟
وہ لشکر جن پہ اتراتے رھے تم
پڑاؤ ، جن میں بویا موت نے کھیت ؟
کہاں دھن دیس کی ؟ اس خواب سے چیت !
بس اب رخصت ، بزرگوں کے وطن کو
وداع ھو پیارے جرگے ، نرم رو دون *

---

* پوشکن نے یہاں لفظ Тихий Дон لکھا ھے یعنی نرم رو ، دھیما دریائے دون۔ دریا کی نرم روانی کی نسبت سے یہ نام پڑ گیا ھے ، یہیں سے شولوخوف نے اپنے شہرہ آفاق ناول کا نام لیا ھے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

گلابی لڑکیو، خوں ریز جنگو !
چھپا ہے گھاٹ پر دشمن یہاں کون ؟
لگا اک تیر قاتل، کھل گیا طاق
کگارے پر لہو، دریا میں قزاق

کبھی جب ہو اندھیرا گھورساون
ہوا سیلی ہوئی، گلیوں میں پھسلن
گھروں میں بال بچے چین سے ہوں
انگیٹھی میں سلگتے کوئلے ہوں
اگر ایسے میں گھوڑے سے اتر کر
تھکا ماندہ کوئی آجائے گھر پر
پہاڑوں میں کہیں اٹکا ہو دن بھر
سکڑ کر بیٹھ جائے، آگ تاپے
تو کتنا جھک کے پیش آتا ہے چرکس
شرافت سے، ادب سے، نمرتا سے؛
کٹورے میں "چِہر"، انگور کا رس
تکلف کیا، یہی موجود ہے، بس !
لبادے میں نمی، چھت میں دھواں ہے
جو کچھ حاضر ہے نذر میہماں ہے
سحر تک نیند گہری، روح تازی
یہیں رہ جائےگی مہمان نوازی

مناتے ہیں خوشی جب عید کے دن
اکٹھے ہوکے سب نوعمر کمسن
تو پھر کھیلوں کا ہوجاتا ہے آغاز :
نکل آتے ہیں سب بھر بھر کے ترکش
نوکیلے تیر ہیں پردار سرکش
گرالیں بادلوں میں اڑتے شہباز ؛
کبھی وہ اونچی اونچی ٹیکری پر
کھڑی کرلیں گے بےصبری قطاریں
مقرر کرکے نیچے اک نشانہ

بڑی پھرتی سے جب ہوں‌گے روانہ
بھریں‌گی چوکڑی ہرنوں کی ڈاریں
اچھلنا ، کودنا ، مٹی اڑانا

مگر ہو جن کی گھٹی میں پڑی جنگ
وہ یکسانی سے ہوجاتے ہیں دل تنگ
یہی تیوہار اور تفریح کے کھیل
کبھی یوں ڈال دیں‌گے رنگ میں بھنگ
کہ محفل میں کہیں معمولی تکرار
بڑھی آگے تو چل‌جاتی ہے تلوار
اڑیں بندوں کے سر بےحرمتی سے
بجائیں تالیاں بچے خوشی سے

یہ خونیں معرکے ، تفریح بازی
مگر روسی میں ہے اک بےنیازی
کبھی وہ دن بھی تھے جب روح کی آگ
سلگتی ، کھیلتا وہ موت سے پھاگ
نظر آتا تھا نزدیک اپنا انجام
رہے یا جائے سر ، لیکن رہے نام
کئی ڈوئل * لڑے تھے بےمحابا
چلی تھیں گولیاں بھی جان‌لیوا
تعجب کیا کہ ہو اس فکر میں غرق
اسے یاد آگیا حالات کا فرق
وہ دن جب گھیرتے تھے دوست احباب
مچاتا دھوم ، ہوتی بزم شاداب ...
اسے افسوس ہے کیا ان دنوں کا ؟

---

* Duel — حریف سے بےعزتی کا انتقام لینے کے لئے دست بدست مقابلہ ، جو مقررہ اصول کے مطابق تنہائی میں تلوار یا پستول سے کیا جاتا تھا اور قانون بھی اس کا فیصلہ تسلیم کر لیتا تھا ۔ (ظ ۔ ا ۔)

امیدیں لے گیا ماضی کا جھونکا
بہت ممکن ہے یہ بےرنگ تصویر
یہ سادہ مشغلے ، سنگین ، گمبھیر
اجڈ یہ لوگ، ان کی ریت رسمیں
الجھتی ہوں کہیں تارنفس میں
اک آئینہ نظر کے سامنے ہے
چھپا رکھی ہے سینے میں کوئی شے
کھلا ماتھا سہی روسی کا ، لیکن
بدلتے ہی نہیں تیور کسی دن
یہ بےفکری ، دلیری اور رکھائی
جیالے چرکسوں میں رنگ لائی
جو دیکھا ، رحم کے قابل سن‌وسال
تو شفقت کی مگر سرگوشیاں بھی
کہ ہم نے اب کے مارا ہے بڑا مال

دوسرا حصہ

تو لذت آشنا ہے اے پہاڑن
مزا جینے کا ، من کی موج معلوم
شرارے تیری ان آنکھوں کے معصوم
خوشی اور پریم کے دیتے ہیں درشن
اندھیری رات میں جب تیرا ساجن
گلے لگتا ہے ، تجھ کو چومتا ہے
پگھل کر لطف سے ، ہوتی ہے بےخود
زمیں کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے
مناتی ہے اسے ''اے میرے قیدی
خوشی بھرلے بجھی آنکھوں میں اپنی
مری چھاتی میں سر اپنا چھپالے
دکھی مت ہو، محبت کا مزا لے
وطن اور قید کا اتنا نہ کر غم

نکل کر جنگلوں میں بھاگ لیں ہم
جہاں تو ہے ، وہیں سکھ میرے راجہ
تو پہلا پیار ہے ، الفت نبھا جا
یہ آنکھیں وہ ، جنھیں لب چھو نہ پائے
مرے بستر سے کتراتے ہیں سائے
نہیں آئی ہے اب تک نام پر آنچ
ادھر کا رخ کریں کیا نوجواں لوگ
مجھے بےدرد کہتے ہیں یہاں لوگ
مگر تقدیر نے یہ دن دکھایا۔
ہیں کٹر میرے بھائی اور ابا
خبر ہے مجھ کو ، کرلی ہے کہیں بات
کھرا سودا ہوا ہے ، دور دیہات
یہ بیچیں‌گے کسی کم بخت کے ہاتھ
کروں‌گی منتیں ، مانی تو مانی
نہیں تو زہر یا خنجر کی ٹھانی
کوئی انجانی قوت آپ سے آپ
لیے جاتی ہے تیری اور تن‌من
بھری ہے مجھ میں تیری چاہ ساجن ... ،،

مگر یہ غمزدہ ، خاموش قیدی
جنون شوق اس کا دیکھتا تھا
خیالوں میں بھی اک طوفان برپا
لگن یہ بھی نظر کے سامنے تھی
کبھی گم ہو تو اگلی پچھلی یادیں
گھٹیں سینے میں، دیوانہ بنا دیں
یہ حالت کرگئی بےتاب ، ناچار
بھری آنکھوں سے آنسو کا بندھا تار
پڑی تھی دل میں سیسے کی سی گولی
کسی ناکام الفت کا زمانہ
غرض اک دن زباں قیدی نے کھولی
سنا ڈالا اسے غم کا فسانہ :

"سنو، سنتی ہو مجھ کو بھول جاؤ
تمہارے عشق کے قابل نہیں میں
جوانوں میں کسی سے دل لگاؤ
یہ سن، یہ دن نہایت قیمتی ہیں
محبت جب کسی کی پاؤگی تم
تو میری بےرخی کا غم نہ ہوگا
لبوں کی آنچ، یہ اٹھتی جوانی
نزاکت کی نظر، آتش بیانی
ملے ان کو وفا اور قدردانی
چراغ اس حسن کا مدھم نہ ہوگا۔
نہ سر مستی، نہ الفت کا مجھے ہوش
ٹھٹھر جائےگا میرے ساتھ یہ جوش
نظر آئےگی الفت بدنما داغ
گھٹا اترےگی، مرجھا جائےگا باغ
پڑے رہ جائیں گے یادوں کے گھاؤ
مجھے چھوڑو، دکھی ہوں، رحم کھاؤ!
ذرا پہلے ملی ہوتیں مری جان
وہ دن جب دل کو تھے جینے کے ارمان
خیال‌وخواب کا نشہ تھا چھایا
نہیں — میں مر چکا، ان کی طرف سے
سمے بیتا، گئی عیشوں کی مایا
اثر ہوتا نہیں جذبوں کا مجھ پر
یہ نازک آبگینے اور میں پتھر ...،،
ستم ہوگا کہ جیتے جاگتے پیار
ملیں بےجان ہونٹوں سے تو ترسیں
ادھر آنکھیں بھرآئیں، اشک برسیں
تبسم کا ادھر بڑھتا ہو اصرار
جلاتی ہو رقابت کی کڑی دھوپ
مگر ہو روح بےحس، نیند مدھوش
کسی کی آنچ سے ہو گرم آغوش
تصور میں بسا ہو اور کا روپ

جب ایسے لطف سے تم ہلکے ہلکے
سمو لیتی ہو بوسے ہونٹ مل کے
رسیلا وقت یہ الفت کا ، چپچاپ
گزرجاتا ہے تم پر آپ سے آپ
یہ لمحے چین کے اور میرے آنسو
نہیں رہتا کبھی آنکھوں پہ قابو
نظر آتی ہے بس تصویر جاناں
میں گویا خواب میں سنتا ہوں آواز
بلا لیتی ہے مجھ کو دور ہمراز ؛
کہاں کا دیکھنا ، سننا ، سنانا ؛
بظاہر ہے تمہارا پہلوئے ناز
کوئی آغوش میں ہے غائبانہ
یہ ویرانی ، یہ اس کی یاد کا سوگ
بجھے کیا آنسوؤں سے عشق کی پیاس
جدھر جاؤں ، کھٹکتا ہے یہ احساس
وہی ہے ساتھ ، میری روح کا روگ

نہ چھیڑو مجھ کو ، اب میں اور یہ زنجیر
رہیں‌گے خواب کی تنہائیوں میں
نہ آنسو خشک ہوں‌گے اور نہ یادیں
نہ تم سے ہو سکےگی غم کی تدبیر
کیا اقرار دل نے— سن چکیں تم ؛
ملاؤ ہاتھ— بس جانے دو ، رخصت !
سمے کا راگ نسوانی محبت
یہ درد ہجر ہو جائےگا خود گم
اتر جائےگا دریا ، دل کھلےگا
کوئی پھر چاہنےوالا ملےگا ،،

وہ چپ چپ ، اشک روکے ، ہونٹ کھولے
سنا کی ساری باتیں ضبط کے ساتھ
جمی تھیں اک طرف دھندلائی نظریں

ملامت کے مگر ظاہر تھے جذبات
بدن پھیکا تھا ، چہرہ زرد کم کم
لرز جاتی تھی پرچھائیں سی؛ تاہم
اسی کے ہاتھ میں تھا برف سا ہاتھ ۔
غم الفت نے اکسایا ، بالاخر
زباں پر آگئی وہ دکھ بھری بات :

'' ارے روسی ، ارے پردیسی مہمان
خبر مجھ کو نہ تھی کچھ تیرے دل کی
نجانے ہوگئی کیوں تجھ پہ قربان !
بہت دن تیری باہوں میں نہ گزرے
نہ سکھ پایا کبھی جی بھرکے میں نے
بہت راتیں نہ بیتیں دکھ سے خالی
خوشی کی رات قسمت نے چرالی ۔
خبر کیا ، پھر یہ دن آئیں نہ آئیں
بچھڑکر پھر کہیں ملنے نہ پائیں ؟
غنیمت تھا کہ جھوٹا پیار دے کر
مری نادانیوں پر رحم کھاتا
جتانے سے تو چپ رہنا تھا بہتر
دکھاوا پریم کا کرتا ، نبھاتا ۔
کٹھن تھا یہ سمے، کچھ کام آتی
میں تیرے ساتھ رہتی، غم بٹاتی
تجھے ملتا مرے آنچل کا سایہ
نہ دل دکھتا ، نہ بیکل نیند آتی
تری مرضی نہیں تھی ، خیر تو جان
مبارک تجھ کو ، روسی ، تیرے ارمان
مگر میں بھی سنوں ، ہے کون وہ نار
چہیتی تیری ؟ تجھ سے اس قدر پیار ؟
ترا غم اب میں سمجھی ، حال سن کر
پر آنسو ہیں مرے قابو سے باہر
برا مت ماننا ، ہنسنا نہ ان پر ،،

کہا اتنا اور آگے کہہ نہ پائی
کہ آہوں آنسوؤں کا بندھ گیا تار
لرزتے ہونٹ ، ناراضی کے آثار
لیے آغوش میں قیدی کا زانو
گھٹی سانسیں تھیں ، بےحس دونوں بازو
دیا قیدی نے دکھیا کو سہارا
سنبھالا ہاتھ سے، بولا '' خدارا
نہ روؤ تم کہ رونا ہے بری فال
بہت غم کر چکے ہیں مجھ کو پامال
دو طرفہ آگ تھی ، کہنا ہے مشکل
محبت میں جلا تنہا مرا دل
زمانہ اب مجھے کردے فراموش
چھپا لےگی یہ ویرانے کی آغوش
یہیں ہوجائےگا شعلہ سیہ‌پوش
بنےگی قبر اس پردیس میں تنگ
یہ سوکھی ہڈیاں زنجیر کا زنگ ،،

چلی رات اور ستارے ٹمٹمائے ؛
پہاڑوں کی بلندی پر کہیں دور
پڑا تھا برف کا شفاف کافور
بجھی آنکھوں سے دونوں سر جھکائے
جدا ہوکر چلے خاموش سائے

ہوا معمول اس دن سے کہ قیدی
کیا کرتا تھا تنہا گاؤں کا گشت
شفق بھی پھولتی ، تپتا بھی تھا دشت
افق کے راستے آتے نئے دن
گزر جاتیں شبیں ، سر پر لیے طشت
لگن اب بھی تھی آزادی کی لیکن -
کہیں چیتل ، کہیں بکرے پہاڑی ،
اگر پتہ کھڑکتا ، ہلتی جھاڑی

تو گھبرا کر جھٹک دیتا تھا زنجیر
نجانے کس طرف سے آ لگے تیر ۔
اگر قزاق لوٹیں رات کو گاؤں
غلاموں کے کھلیں زنجیر سے پاؤں
لگاتا ھانک ان فکروں میں رہ کر
وھاں سناٹا ، پانی اور پتھر
پکار انسان کی سن کر درندے
اندھیری جھاڑیوں میں بھاگتے تھے ۔

پہاڑوں میں مچا طوفان اک بار
لڑائی کی سنی قیدی نے للکار
'' چلو گھوڑوں میں ، گھوڑوں میں ،، کی آواز
کسے جھٹ پٹ چمکتی دھات کے ساز
دمکتی زرھیں اور کالے لبادے
ھوئے تیار گھوڑے زین لادے
پلا تھا تیغ کی چھاؤں میں سب گاؤں
کمر بستہ ھوا یلغار کرنے
بڑھا یوں ، چوٹیوں سے جیسے جھرنے
مچائی ساحل '' کوبان ،، * پہ دہشت
وصولیں گے وھاں مال غنیمت

بھری دوپہر ، سویا گاؤں تھک کر
ھیں پہریدار کتے گھر کے باھر
پھٹے حالوں ھیں شوخ و شنگ بچے
سلونے سانولے ھڈنگ بچے
بڑے بوڑھوں کے دم کی ھے یہ رونق
جو بیٹھے ھیں یہاں گھیرا بنائے

---

* کوبان — شمالی قفقاز کا مشہور دریا جس کے ساحل بہت بار رنگین ھوئے ھیں ۔ کوبان بحیرۂ آزوف میں گرتا ھے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

دھواں اڑتا ہے ، حقے دم پر آئے
کنواری لڑکیاں ، مانوس سرگم
ہوئے جاتے ہیں بوڑھے بھی جواں دم

چرکسوں کا گیت

(۱)

دریا میں لہریں ، لہروں میں ہلچل
راتوں میں سوتے ہیں چپ چپ پہاڑ
لوہے کی برچھی ، تکیہ ہے تیرا
کاہے پپوٹوں کے بھیڑے کواڑ
سونا نہیں رے تھک کر قزاقا ، سونا نہ پاؤں پسار
چھپ کر اندھیرے میں چیچن پھرے ہے دریا کے پار

(۲)

دریا میں نوکا ، نوکا ہو ڈگمگ
ڈگمگ ڈولے تیری نیا ، رے قزاقا
ڈوبے گا دریا میں ، سر ہوگا نیچے
غوطہ لگاویں جیسے بچے کھلار
گرمی کے دن ہیں غوطہ لگالے ، ٹھنڈی ہے پانی کی دھار
قزاقا ، چیچن پھرے ہے دریا کے پار

(۳)

دریا میں پانی ، پانی مقدس
اس کے کنارے ، ہرے بھرے گاؤں ہمارے
گاتے بجاتے سنگیت منڈل ، پھیلے ہیں سارے
بھاگو رے روسی گویو ، پڑے گی لتاڑ
بھاگو رے سرخو ، جلدی سے گھر کو ، بھاگو یہاں سے ٹھار
چیچن پھرے ہے دریا کے پار

ادھر گیتوں کی دھن ، ساحل پہ روسی
اسی دھن میں کہ کیسے بھاگ لوں میں
پڑی ہے پاؤں میں زنجیر بھاری
بہاؤ تیز ، گہرا ، کیا کروں میں ؟ ..
انھی فکروں میں آخر ہوگئی رات
شجر سوئے، چڑھی چوٹی پہ ظلمات
پھرا ہے کچی دیواروں پہ چونا
وہ پھیکی چاندنی ، وہ گاؤں سونا
پنک میں ہیں ہرن اور بارہ سنگھے
پہاڑی باز بھی تھک کر ہیں چپ‌چاپ
چٹانیں گونجتی رہتی ہیں کچھ دیر
اگر پڑتی ہے گھوڑوں کی کہیں ٹاپ

یہ عالم تھا کہ آہٹ سی ہوئی کچھ
جھلک دیکھی ، وہی لڑکی تھی سچ‌مچ
اڑا تھا رنگ جب چادر اٹھائی
دبے قدموں سے اس کے پاس آئی
تلاش لفظ میں تھے مضطرب لب
بھری تھیں آنکھ میں بےچینیاں سب
ڈھکے سینے کو اور شانوں پہ ڈالے
پریشاں زلف ، لمبے بال کالے
لیے فولاد، دونوں ہاتھ بھاری
ادھر آری ، ادھر خنجر تھا کاری
وہ گویا جنگ پر نکلی ہو اس رات
لگائی ہو کہیں شبخون کی گھات

نظر قیدی پہ کی ، بولی ’’ نکل جا
کہیں چرکس نہ رستے میں ملے گا
یہ خنجر ساتھ رکھ ، ہے رات کا وقت
ذرا جھٹ‌پٹ ، نہیں بس بات کا وقت

اندھیرا ہے ابھی ، سوتا ہے سب گاؤں
نشانی بھی نہ چھوڑیں گے ترے پاؤں ،،

سنبھالی کانپتے ہاتھوں میں آری
جھکی قدموں میں اس کے، غم کی ماری
چلی آری ، کٹا لوہے سے لوہا
مگر آنسو بھی تھے آنکھوں سے جاری
کھلیں زنجیر کی کڑیاں ٹھناٹھن
'' لے، اب آزاد ہے تو ، بھاگ فورن ،،
وہ نظریں کہہ گئیں روداد ساری :
محبت آگ ہے، ہم اس کا ایندھن
ہوا نے زور سے الٹی جو چادر
کھلا چہرے سے ، کیا صدمہ ہے دل پر -
'' سنو ، اے مہرباں ،، روسی پکارا
'' تمہارا ہوں میں، جیتے جی، تمہارا
بلا ہے یہ جگہ — کر لیں کنارہ
چلیں ہم تم ، نکل چلتے ہیں اک ساتھ ،،
'' نہیں، روسی، نہیں، جانے دے یہ بات
مری قسمت کی خوشیاں اڑ چکی ہیں؛
مزا چکھا بہت کچھ زندگی کا
سدھارے دن سہانے، رہ گئی میں -
کسی پر ہے فدا آخر ترا دل
اسی کو پیار کر ، اس سے گلے مل
مجھے جلنے کا کیا حق ، کیوں کروں غم ؟
رہے تیری محبت شاد آباد
خدا حافظ ، تجھے ہو چین ہر دم
خدا حافظ ، نہ کرنا دکھ مرا یاد
ملالے ہاتھ ، ہوتے ہیں جدا ہم ،،

نیا جیون ملا قیدی کے من کو
بڑھائے دونوں بازو چرکسن کو

لپک کر ، گود میں بھر کر کیا پیار
وہ بوسہ رخصتی ، وہ عشق لاچار
جدا ہوتے نہ تھے لب آخری بار
چلے دریا کی جانب ہاتھ تھامے
نہ حرفے، نے پیالے، نے کلامے
سرکتا ، تیرتا موجوں میں روسی
نکل کر دوسرے ساحل پہ پہنچا
کگارے تھے جہاں کے آبنوسی ...
قدم رکھا ہی تھا مشکل سے اوپر
گرا جیسے ادھر پانی میں پتھر
سنی کچھ دور سے اک ڈوبتی آہ ...
نظر دوڑائی پھر کر اس کنارے
وہی جھاگ اور وہی اجلے کگارے
مگر وہ چرکسن ، وہ حسن مہجور
نظر آئی نہیں نزدیک یا دور
پہاڑوں میں ، نہ دریا پر پتہ ہے
پون بہتی ہے ، ساحل سورہا ہے
چھچھلتا ، ناچتا پانی ندی میں
ہوا جاتا ہے غائب چاندنی میں

جو ہونا تھا ہوا — بس ، جاؤ رخصت
یہی ہے آخری ان سب کا دیدار
وداع اے سونے گاؤں ، کچی دیوار
یہ کھیت ، ان میں چرائے تھے مویشی
یہ کھڈ ، جن پر کبھی پھرتا تھا قیدی
یہ نالا ، دوپہر گرمی کا آرام ؛
اجڈ چرکس ، یہاں جب بیٹھ جاتے
تو آزادی کے ، پہروں ، گیت گاتے

اندھیرا چھٹ چلا ہے آسماں پر
ہوا گھاٹی میں ہلکا سا اجالا

شفق پھولی ، سویرا ہونےوالا
گئی ہے ایک پگڈنڈی بہت دور
چلا آتا ہے قیدی اس پہ مغرور
یہاں ہے روسی ناکہ بندی آگے
یہاں آٹھوں پہر قزاق جاگے
صدا لگتی ہے ٹیلوں سے برابر

ختم کلام

تخیل کے پروں سے اڑنےوالی اک ترنگ آئی
چلی وہ ایشیا کی سرحدوں پر
اور کوہ قاف سے کچھ پھول چن لائی
کہ سہرے میں یہ جنگلی پھول بھی دیں‌گے بہار اپنی -

قبیلے ان علاقوں میں بسے ہیں جنگ کے رسیا
وہ بانکی ترچھی پوشاکوں پہ للچائی
نئی سج دھج میں دیکھا میں نے یہ جلوہ
تخیل کا کرشمہ یا وہ جادو کا تماشا تھا -

پھری ویران دیہاتوں میں ، ان اجڑے دیاروں میں
تن‌تنہا چٹانوں کے کیے پھیرے
یہاں برباد دوشیزاؤں نے جو گیت گائے تھے
سنائی دے رہے تھے بول ان کے اور وہی تانیں -

پسند آئے اسے جنگی ٹھکانے
اور جیالے ویر قزاقوں کے ہنگامے
وہ ٹیلے، ٹیکری، سنسان قبرستان کا منظر
جہاں گھوڑے بدکتے، ہنہناتے تھے -

نجانے کتنے قصے، کتنے گانے
ابھی ازبر ہیں افسانوں کی اور گیتوں کی دیوی کو
نجانے کب سنادے داستانیں
جو ہیبت‌ناک قزاقوں کے دم سے سانس لیتی ہیں ۔

نجانے کب دیار غیر کے قصے سنا ڈالے
کہ اک مستی‌سلاف * آیا تھا اپنے وقت کا رستم
اکیلا پہلوانوں سے لڑا — مارے گئے روسی
لیا بدلہ حسیناؤں نے ان سے نرم بستر پر ۔

زباں پر میری آجائے وہی عظمت ، وہی دم خم
کہ جب قفقاز کے سرکش سپوتوں سے
بڑی خوں‌ریزیوں کے بعد غالب آگئے لشکر
اٹھا پرچم پہ دوہرے سر کا شاہیں، سرخرو تھے ہم ۔

لہو دریائے تیریک * * کی سفیدی میں گھلا جس دم
چٹانیں گونج اٹھیں روس کے ڈنکے کی چوٹوں سے
جہاں کھنچتی تھیں تلواریں
وھیں روشن تھی سیسیانوف * * * کی مردانہ پیشانی ۔

---

* مستی‌سلاف ، روس کا مشہور سپہ‌سالار ، جس نے چرکسوں سے جنگ کی اور ان کے سپہ‌سالار کو تنہا مقابلے میں شکست دے کر علاقہ فتح کر لیا ۔ (ایڈیٹر)

* * تیریک — شمالی قفقاز کا مشہور دریا ، جس کے ساحل بہت بار رنگین ہوئے ہیں ۔ تیریک بحرکیسپین میں گرتا ہے ۔ (ایڈیٹر)

* * * سیسیانوف (۱۸۰۶ ء — ۱۷۵۶ ء) — روسی سپہ‌سالار جس نے قفقاز کی جنگوں میں نام پیدا کیا ۔ جارجیائی نواب ۔ (ایڈیٹر)

قصیدے گاؤں کتلیاریفسکی* کی شان میں
کہ تھا جلاد کوہ قاف کا اور روس کا ہیرو ؛
دلوں میں تیری دہشت یوں سمائی تھی
جہاں تیرے قدم پہنچے ، وہیں گویا وبا پھیلی ۔
اتارے سر جوانوں کے ، قبیلے کردیے غارت
پسند آتی نہیں اب تجھ کو خوں‌ریزی
وہ تیری انتقامی‌تیغ آخر نیام میں اتری ،
ابھی تک آن کا نشتر چبھا ہے تیرے سینے میں
سکوں کی زندگی اور گھر کی آسائش ملی تجھ کو
مگر بےچین ہے دل ، اب بھی راحت کا نہیں عادی ۔

وہ دیکھو ، پھر اٹھی مشرق میں چنگاری
خبردار ، اب نہ اٹھنے پائے کوہستان کا یخ بستہ سر ہرگز
سن اے قفقاز یرمولوف** آتا ہے !

بہت گونجا کیے ، آخر وہ نعرے پڑ گئے ٹھنڈے
یہاں اب ہر طرف ہے روس کی شمشیر کا سایہ
لڑے ، مارے گئے خوددار کوہ قاف کے بیٹو ،
ہمارا خون بہہ‌کر بھی تمہارے کچھ نہ کام آیا

ہلاکت نے چبالیں زرہیں، سب تعویذ اور گنڈے
پہاڑوں کی کمر
گھوڑوں کی چستی اور چالاکی
محبت کا جنوں شوق بھی غارت ہوا یکسر

---

* کتلیاریفسکی ، پیوتر استیپانووچ (زمانہ ۱۷۸۲ ء سے ۱۸۵۲ ء تک) ۔ اس نے روس اور ایران کی جنگ ۱۸۱۳ ء — ۱۸۰۴ ء میں پیدل فوج کی سپہ‌سالاری کی اور فتوحات میں شہرت پائی ۔ (ایڈیٹر)

** یرمولوف (زمانہ ۱۷۷۶ ء سے ۱۸۶۱ ء تک) — مشہور روسی جنرل ۔ پہلے نپولین کے مقابلے میں اور پھر ۱۸۱۷ ء سے قفقاز کی جنگوں میں نام پیدا کیا ۔ زارروس الیکساندر اول کی سیاست کا مخالف اور دسمبر ۱۸۲۵ ء کے باغیوں میں مقبول تھا ۔ (ایڈیٹر)

جو باتی‌خان * پر بیتی وہی قفقاز میں ہوگا
قبیلہ بھول جائےگا لڑائی باپ دادا کی ،
نہ کل رہجائےگا باقی یہ شوروشر ؛
اٹھاکر اک طرف رکھ دیںگے ترکش آنےوالے دن ۔
گپھائیں اور درے جن میں چھپ کر بیٹھتے ہو تم
مسافر بےخطر گزریںگے ان کے سامنے ہوکر ۔

تمھارے ٹوٹ‌جانے کی کہانی ان چٹانوں میں
کوئی اک داستاں ہوگی پرانی داستانوں میں ۔

۱۸۲۱ ء — ۱۸۲۰ ء

---

* باتی‌خان — چنگیزخاں کا پوتا، جس نے زریں خیل (Golden Horde) لشکر تیار کیا تھا ۔ ۱۲۳۵ ء کے بعد سے اس لشکر نے ریازان ، ماسکو ، ولادیمیر پر قبضہ کیا ، پھر کیئف کے راستے (۱۲۴۰ ء) ہنگری پر چڑھائی کر دی ۔ ۱۲۵۵ ء میں جب وہ مرا تو روس، یوکرین اور مشرقی یورپ کے کئی علاقے اس کے قبضے میں تھے ۔ (ظ ۔ ا ۔)

باغیچہ سرائے کا فوارہ

بریں چشمہ چوں من بسے دم زدند
برفتند و چوں چشم بر هم زدند
چرا دل بریں کارواں گه نهیم
که یاراں برفتند و ما در رهیم
(سعدی)

اپنی آنکھیں جھکائے گیری خاں
دمبدم چھوڑتا ہے منھ سے دھواں
ہاتھ باندھے کھڑے ہیں خدمتگار
ایک حلقے میں بےزباں، ناچار
ہر طرف اک مہیب سناٹا
باادب، با ملاحظہ ہے فضا
غم و غصہ دکھا رہا ہے اثر
خان کے ادھموے سے چہرے پر
حاکم وقت نے اٹھایا ہاتھ
اک اشارہ کیا جلال کے ساتھ
بدحواسی میں فرش تکنے لگے
دے کے تعظیم سب سرکنے لگے

تھم کے دیوان خاص میں تنہا
بوجھ سینے کا کرلیا ہلکا
روح بےچین، دل میں تھی ہلچل
سخت ماتھے پہ پڑ رہے تھے بل
جیسے لائیں گھٹائیں طوفانی
موج در موج اینڈتا پانی

روح کو اضطراب ہے کیسا؟
کن خیالوں میں گم ہے، فکر ہے کیا؟
روس پر لے کے جائےگا لشکر

یا ہے پولینڈ اب کے پیش نظر ؟
خوفناک انتقام کی شورش
یا کھلی فوج میں کوئی سازش ؟
سر اٹھایا پہاڑوالوں نے ؟
یا '' گینویا ،، * کی تیز چالوں نے
اس کو یوں بدحواس کر ڈالا ؟
کیسے عیار سے پڑا پالا !

اب ہیں بےلطف جنگ کی دھومیں
سر میں سودا نہ زور بازو میں ۔

کیا خبر ، ہو حرم کی بات کوئی
بےوفائی کی واردات کوئی
وہ جو اک نازنیں کنیز ہے ، کیا
کسی بےدین پر ہوئی ہے فدا ؟

نہیں، گیری کی عورتوں میں کہاں
یہ مجال ، ایسے شوق ، یہ ارماں !
من کی من میں دبا کے ملتی ہیں
غم کی باسی ہوا میں کھلتی ہیں
تن پہ پہرہ ، خیال پر پہرہ
زندگی بھر خوشی سے بےبہرہ
قیدخانہ محل سرا ہے تمام
حسن کی صبح اور قید کی شام
جیسے شیشے کے گھر میں درپردہ
پھول مہکے ہوں سایہ پروردہ
روز و شب ، ماہ و سال جاتے ہیں
دے کے ان کو ملال جاتے ہیں
اور اڑی جا رہی ہے ان کے سنگ

---

* گینویا — کرائمیا کے ساحل پر ۱۳ ویں صدی میں اطالوی قبیلے گینویا کی تجارتی بستیاں قائم تھیں ۔ تاتاری حکومت سے ان کی جھڑپ رہا کرتی تھی ۔ (ظ ۔ ا ۔)

نوجوانی کی، عاشقی کی امنگ
ایک ڈھرے پہ ہے جو روز کا حال
وقت چلتا ہے چیونٹی کی چال
کاہلی پر مدار کاموں کا
بھولے بھٹکے بہار کا جھونکا
ہیں جوان عورتیں، مچلتی ہیں،
دل کے بہلانے کو بدلتی ہیں
ایک سے ایک شاندار لباس؛
چہلیں، آپس کی بات‌چیت، ولاس
یا کہیں چھلچھلاتے دھاروں پر
صاف شفاف آبشاروں پر
گھومتی ہیں گھنے چنار تلے
جس طرح ہرنیوں کی ڈار چلے
بیچ میں اک خبیث خواجہ سرا
جس پہ چلتا نہیں کوئی حربہ؛
ان سبھوں پر لگے ہوئے دن رات
بدگماں کان اور نظر بدذات
ہوشیاری کا، دوڑ دھوپ کا پھل
قاعدے سخت اور ان پہ عمل
ہے وہ قانون خان کا منشا
جس میں ممکن نہیں ہے چون‌وچرا
بلکہ قرآن پاک کے احکام
خان کے بعد واجب‌الاکرام
نہ محبت کی اس کے دل کو پیاس
مورتی کی طرح نہ کچھ احساس
پھبتیاں، چھیڑ چھاڑ، صلواتیں
چبھتے فقرے، جلی کٹی باتیں
روٹھنا، منانا، التجا کرنا
آہ بھرنا ہو یا گلہ کرنا
اس پہ کرتے نہیں ذرا بھی اثر
سارے تریاچرتر کی ہے خبر؛

کبھی بندہ رہا ، کبھی آزاد
گر بہت ہوگئے ہیں اس کو یاد ۔
ہے لگاوٹ کی آنکھ نرم نگاہ
آنسوں کی کٹیلی کڑوی ڈاہ
کوئی بھی ان میں سازگار نہیں
اس کو عورت کا اعتبار نہیں

جب ہو گرمی سے بےقرار بدن
یہ مقید جوانیاں فورن
بال بکھرائے اپنے شانوں پر
تیرنے آ پہنچتی ہیں اکثر
جلتی چھاتی پہ لہر چھپک چھو ،
چلتے پانی میں حسن کا جادو ۔
ان کی اٹکھیلیوں میں بھی ہر بار
ہے اٹل پہرہدار سر پہ سوار
دیکھے جاتا ہے بےجھجک بےننگ
نازنینوں کے جسم ، ننگ دھڑنگ ۔
چھائی ہو جب حرم پہ کالی رات
گشت کرتا ہے اس قدر محتاط
نرم قالین اور غالیچے
دم بخود اس کے پاؤں کے نیچے
کان چوروں کی طرح آہٹ پر
ایک سے دوسرے چھپرکھٹ پر
عورتیں خواب ناز میں ہیں مگن
اور اسے مستقل یہی الجھن
کہ کوئی آہ سرد ، گہرا سانس
ہاتھ آئے کسی کے دل کی پھانس
نیند میں لےدیا جو غیر کا نام
ایسی غفلت کا ہے برا انجام
یا سہیلی کو پا کے نیک صفات
راز میں کہہ دی ایسی ویسی بات

کیا ہوا ؟ کیوں اداس ہے گیری ؟
جان سوکھی ہوئی ہے حقے کی ؛
سانس روکے کھڑا ہے خواجہسرا
در پہ ہے منتظر اشارے کا
حاکم وقت چل دیا اٹھکر
گمسم اتنا کہ کچھ نہیں ہے خبر
باب کھلتے گئے جو پہنچا پاس
کل کے پیاروں کا ہے یہاں رنواس
بیچ میں ایک شوخ فوارہ
چو طرف منتظر ہیں دلآرا
فرش پر نرم ریشمی قالین
ان پہ محفل جمی ہوئی رنگین
بچپنے کی خوشی ہے مکھڑوں پر
دیکھتی ہیں وہ حوض کا منظر
سنگ مرمر کے صاف پانی میں
مچھلیاں ہیں بڑی روانی میں
پھینکے دیتی ہے کوئی متوالی
کان سے اپنے سونے کی بالی
گھومتی ہیں خواصیں لےکر جام
جن میں شربت مہک رہا ہے تمام
ناگہاں گونجنے لگا اک گیت
عورتوں نے نبھائی اپنی ریت

تاتاری گیت

(۱)

دنیا ہے دکھدرد کا ترکش، ہر ترکش میں تیر
رنج کے بدلے راحت دے ہے اک دن چرخ پیر
زخموں کو مرہم بخشے ہے، اشکوں کو تاثیر
حج کرنے جاتے ہیں نصیبےوالے پیرفقیر

(۲)

ہے وہ شہید نصیبےوالا جس نے دےدی جان
جس کو تھے ڈنیوب کنارے * مرنے کے ارمان
خون بھرے چولے میں دولھا ، واہ رے اس کی شان
جنت اس کی راہ تکے ہے ، حوریں ہیں قربان

(۳)

اس کے نصیبوں کا کیا کہنا، جس کو ملی سوغات
پیاری زریمہ ، نازوں پالی ، چکنے چکنے پات
تجھ کو حرم میں چین‌دیا ، پھولوں میں بسائی رات
جس نے تیرے ناز اٹھائے ، پیار سے تھاما ہات

خود زریمہ کہاں ہے مہ پارہ ؟
بزم کا حسن ، عشق کا تارہ
غم کے ہاتھوں نڈھال ، چہرہ زرد
اپنے گن‌گان سے بھی ہے دل سرد
جیسے آندھی میں جھول جائے درخت
سرنگوں وہ بھی ہوگئی ناوقت
زندگی نے تمام سکھ چھینے
جب سے بدلی ہے آنکھ گیری نے

بےوفائی کی بات اور ہے پر
حسن میں کون ہے ترا ہمسر ؟
اے گروزینہ ، ہے تری شوبھا
دوہری چوٹی میں، چمپئی ماتھا
تیری آنکھیں حسین متوالی
دن سے اجلی ہیں، رات سے کالی
تیری آواز میں وہ دیپک راگ

---

* دریائے ڈنیوب کے کناروں پر تاتاریوں اور روسیوں ، یوکرینیوں میں کم و بیش ایک صدی تک جنگیں ہوتی رہی ہیں ۔ (ظ ۔ ا ۔)

شعلہ دیتی ہے جس سے تن کی آگ
کس کے بوسوں میں ہے یہ کاٹ یہ جوش
جو اڑا دے بڑے بڑوں کے ہوش؟
دل کی نگری جو تجھ سے ہو آباد
پھر کسی حسن کو کرے کیوں یاد؟
پر یہ بےدرد بےرخا گیری
کس طرح تجھ سے یوں نظر پھیری!
سرد راتیں گزار دیتا ہے
پیار لیتا، نہ پیار دیتا ہے
جب سے پولینڈ کے بڑے گھر کی
اک حسینہ حرم میں لائی گئی

کچھ دنوں پہلے ماریا نوخیز
دور کی کیاریوں میں تھی گل‌ریز
کچھ دنوں پہلے اپنے سائے میں
یوں سہکتی تھی جیسے پھول کھلیں
ناز کرتا تھا اس پہ بوڑھا باپ
اس کے جیون کا تھا یہی پرتاپ
بال ہٹ میں جو وہ مچل جائے
کیا مجال اس کا حکم ٹل جائے!
باپ کو رات دن تھی فکر لگی:
یہ چہیتی، یہ نور چشم مری
سکھ اٹھائے، سدا ہو باغ وبہار
روح میں ہو کھٹک، نہ پاؤں میں خار
اور چلی جائے جب دلہن بن کر
شاد آباد ہو پیا کے گھر
چٹکیاں دل میں لیں گھنے سائے
اس کو بابل کا دیس یاد آئے
بن‌بیاہے دنوں کی بےفکری
خواب کی سی جھلک دکھائے کبھی۔
سارے گن من‌پسند، سب میں رچاؤ

چال میں رکھ رکھاؤ، نرم سبھاؤ
گہرے نیلے نین، بدن چوکس
قدرتی حسن، حسن پر سب رس
گھر میں ہوتے تھے لوگ جب مدعو
وہ جگاتی رباب کا جادو
اہل دولت، امیر، منصبدار
ماریا "یک انارو صد بیمار"
نوجوانوں میں اس کے آرزو مند
تھے بہت، پر ستم‌زدہ، لب بند
وہ تو الھڑ تھی، اس کو کیا معلوم
عشق ہوتا ہے کیا خدا معلوم
دل نہ تھا پریم کی پہیلی میں
دن بہلتے سکھی سہیلی میں
باپ کا قلعہ تھا خوشی کا گھر
عیش کی بجتی نوبت آٹھ پہر

کیا بہت مدتوں کی بات ہے یہ ؟
نہیں، کچھ دن کی واردات ہے یہ
بڑھ کے طوفان کی طرح تاتار
آئے پولینڈ پر کیا یلغار
آگ بھی بھس کو یوں کرے نہ بھسم
جیسے پھونکا انھوں نے سب اکدم
ملک آباد برکتوں والا
جنگ نے خاک میں ملا ڈالا
عیش غارت ہوا، نگر ویران
لٹ گیا قلعہ، خشک و تر ویران
ماریا کی محل سرا تھی اجاڑ -
پھر کھلی خاندان کی ہڑواڑ
ہر طرف سوئے تھے بزرگ کئی
کھودی پہلو میں ایک قبر نئی
لاش تاج و علم لیے لیٹی

قبر میں باپ ، قید میں بیٹی
اب ہے اندھیر نگری، چوپٹ راج
ملک بدنام ، لوگ ہیں محتاج

آہ ، بغچہ سرا کے شاہ نشیں
ان میں وہ نازنین باتمکیں
سر چھپائے نڈھال، روتی ہے
قید میں اپنی جان کھوتی ہے
اس مصیبت‌زدہ پہ کھا کے ترس
گیری اب ہو چکا ہے خود بےبس
وہ تو بھرتی ہے آہیں رو رو کر
خان کی نیند ہو گئی دو بھر ۔
یوں تو ہیں قاعدے حرم کے اٹوٹ
اس کو دے دی ہے ہر طرح کی چھوٹ
وہ جو ہے بدمزاج خواجہ سرا
گشت میں اس طرف نہیں آتا
سیج پر اس کی دیکھ بھال نہیں
گھورکر دیکھ لے مجال نہیں
غسل کو جب اتارتی ہے لباس
ساتھ ہوگی وہی کنیز خواص ۔
خان ڈرتا ہے خود کہ یہ گلفام
قید میں ہو نہ اور بےآرام
تھا حرم سے الگ جو ایک ولا *
اس کو رہنے کے واسطے وہ ملا
اس قدر پرسکون تنہائی
روح گویا یہاں اتر آئی
اک طرف ہے شبیہ پاک صفات
شمع جلتی ہے سامنے دن رات
دکھ بھری آتما کو ہے وشواس

---

* Villa — چھوٹا سا بنگلہ ۔ (ظ ۔ ا ۔)

سونی دنیا میں اک امید ہے پاس
بس یہی روشنی عقیدے کی
بخشتی ہے سکون اور نیکی
یاد آتے ہیں راحتوں کے دن
خوشدلی کے زمانے ، اچھے دن ۔
فاصلے پر ہیں دل جلی سکھیاں
اور یہاں رو رہی ہیں دو انکھیاں
ہر طرف راگ رنگ عیش نشاط
اس میں تنہا وہ ایک عورت ذات
پاک دامن بچی ہوئی ہے ہنوز
معجزے کے حصار میں محفوظ
دل — جو ہوتا ہے خود بڑا پاپی
اتنی بدمستیوں میں رہ کر بھی
شمع ایمان ہے جلائے ہوئے
اپنے خالق سے لو لگائے ہوئے

. . . .

. . . .

چھا گئی رات ، چھپ گیا منظر
سبز کھیتوں پہ سرمئی چادر ؛
اب ہے چپ‌چاپ دیس ”توریدا“ *
دور گونجا ترانہ بلبل کا
تھی ستاروں کی بزم موسیقی
چاند ابھرا ہے اوٹ سے ان کی
دشت و صحرا کہ گھاٹیاں ٹیلے
جس کو پینا ہو چاندنی پی‌لے
ہیں جو بغچہ‌سرائے کی گلیاں
ان میں پرچھائیاں ہیں تیزرواں
تن چھپائے سفید چادر میں
چل کے اک گھر سے دوسرے گھر میں

---

* جزیرہ نمائے کرائمیا کا پرانا نام ۔ (ظ ۔ ا ۔)

سوفتے میں * زنان تاتاری
گپ لگانے چلی ہیں بےچاری
سو چکا ہے حرم ، محل چپ ہے
راحتوں میں نہیں مخل کوئی شے
رات کا یہ سکون ، یہ آرام
بےخلل ہے ، بنا ہوا ہے نظام
ہے نگہبان اعتبار کی چیز
جھانک لی اس نے ایک اک دہلیز
یوں تو اب وہ بھی سو رہا ہے مگر
دل میں خدشے ہیں، جان کانٹوں پر
ہو نہ کوئی دغا فریب کہیں
آنکھ لگتی ہے پر قرار نہیں
شک گزرتا ہے اس کو خواہ‌مخواہ
یہ تھی آہٹ ، کھسر پھسر یا آہ ؟
جھوٹی افواہ نے بھرے ہیں کان
چونکتا ہے خطا ہیں سب اوسان
وہ کنوتی بدل کے ہے تیار
اور یہاں سو رہا ہے سب سنسار
تلملاتے ہیں صرف فوارے
سنگ مرمر کی قید کے مارے
بلبلیں جن کی زندگی ہے گلاب
چہچہاتی ہیں رات کو بےتاب
سنتے سنتے یہ راگ خواجہ سرا
پھر سے کھاتا ہے نیند کا جھونکا

کتنی پیاری ہیں سانولی راتیں،
مشرقی حسن کی یہ سوغاتیں!
یہ شرف امت رسول کو ہے
رات کرتی ہے کس مزے میں طے!

* ضروری کاموں سے نمٹنے پر جو وقت فرصت ملتا ہے اسے ٹھیٹھ دہلی کی زبان میں سوفتہ کہتے ہیں۔ (ظ۔ ا۔)

کتنی آسائش ان کے گھر آنگن
دلربا باغ دلنواز چمن
ہیں حرم ان کے گلشن بےخار ؛
جب نکھرتی ہے چاندنی کی بہار
کل فضا پرسکون راز بھری
جھوم جاتی ہے دل کی شاخ ہری
. . . . . .
بیبیاں سو چکی ہیں ، ایک مگر
سانس روکے ہوئے اٹھی ہے ادھر
دھیرے دھیرے چلی دبے قدموں
کھولا دروازہ کانپتے ہاتھوں
رات بھیگی ، حرم کا پہریدار
کچھ تو غافل پڑا ہے کچھ بیدار
بال پکے ہیں نیند ہے کچی
سونا جھوٹا ہے ، آلکس سچی
بےمروت ہے اس کا پتھر دل
سن سے وہ پار کر گئی یہ سل
. . . . . .
در پہ باہر پڑا ہوا تالا
تھرتھری چھوٹی ہاتھ جب ڈالا
اس نے رکھا ہی تھا قدم اندر
اڑ گئے ہوش دیکھ کر منظر
ایک جانب ہے گوشہ انجیل
ٹمٹماتی ہے سامنے قندیل
بی‌بی مریم کی پاک پیشانی
کچھ اداسی کے ساتھ نورانی
اسی گوشے میں روشنی کے قریب
الفت‌پاک کا نشان صلیب ۔
اک نظر میں بدل گیا تن‌من
کیوں گروزینہ ، ہے نا اپناپن !
بھولے بسرے دنوں کی آوازیں

جاگ اٹھیں ، گونجنے لگیں دل میں
سوئی ہے روتے روتے شہزادی
نیند کی ماتی خواب ، کی عادی
نوجوانی کے خواب، میٹھے سال
تمتماتے ہیں ان کی آنچ سے گال
کچھ تبسم ، کچھ آنسوؤں کے نشان
بھیگے پھولوں کی چاندنی میں اٹھان
گویا نازل ہوا فلک سے ملک
لیٹتے ہی جھپک گئی ہے پلک
خستہ حالت حرم کے قیدی کی
دیکھ کر رو دیا فرشتہ بھی ...
اے زریمہ ، یہ کیا ہوا تجھ کو ؟
غم نے بے حال کردیا تجھ کو
بے خودی میں جھکا رہی ہے سر
دوہری ہوکر کھڑی ہے گھٹنوں پر :
'' عرض سن لو مری، نہ ٹھکراؤ
حال پر میرے کچھ ترس کھاؤ ،،
آہٹ اور اس پہ التجا کی صدا
نیند کا نرم تار ٹوٹ گیا
آنکھ کھولی تو ڈرگئی لڑکی
اجنبی صورت اس کے سامنے تھی
اس کو اوپر اٹھاتے لرزے ہاتھ
پوچھی گھبرا کے صرف اتنی بات :
'' کون ہو تم ؟ .. اکیلی ، رات گئے
کس لئے آئی ہو یہاں ؟ کیسے ؟ ،،
'' میں مدد مانگنے تمہارے پاس
آئی ہوں ، بس بچی ہے ایک ہی آس
مدتوں سے کھلے تھے میرے بھاگ
چین ہر دن ، ہر ایک رات سہاگ
عیش کا کیا ہے ، ڈھلتی پھرتی چھاؤں
بھاگ پھوٹے، پلٹ گیا ہر داؤں

سن یہ بپتا کہ میں یہاں کی نہیں
آنکھ کھولی تھی دور دیس کہیں
ہائے وہ دن ، وہ ان کی ایک اک چیز
اب بھی یادوں میں نقش ہے تعویذ
اونچے پربت تھے آسمانوں تک
گرم دھاروں کی پتھروں میں بھبک
جنگل ایسے گھنے کہ ہو نہ گزار
دوسرے قاعدے ، الگ اطوار
جانے قسمت میں کیا لکھا تھا ، کیوں
گھر سے نکلی تو دور اب تک ہوں
یاد ہے بس کہ تھا کہیں ساگر
آدمی بادبان کے اوپر ...
ایک وہ دن — پھر اس کے بعد مجھے
غم سے پالا پڑا نہ دہشت سے
یہ حرم ، پرسکون ، رنگ محل
اس میں پھوٹی کھلی، مری کونپل
تھی محبت کی پہلی تجربہ گاہ
دل کو سمجھا کے دیکھتی تھی راہ
زندگی نے جو لی اک انگڑائی
میرے دل کی مراد برآئی
خان جب کرچکا بہت یلغار
اور لہو پی کے چھک گئی تلوار
قتل و غارت گری سے اکتایا
اس کو گھر کا سکون یاد آیا
ہم ہوئے پیش ، ہم سے چار کی آنکھ
کھل گئی شوق وانتظار کی آنکھ
اس نے خاموش ایک خاص نظر
مجھ پہ ڈالی بدل گئے تیور
چن لیا مجھ کو — اور اس دن سے
عیش میں ہم نے دن گزار دیے
بدگمانی ، رذالتیں ، بہتان

دکھ رقابت کا ، مفت کے خلجان
ہم میں حائل ہوئے نہ ایک دفعہ
میں نے اب تک نہیں سہی ہے جفا
مارپا ، جب تمہارے سبز قدم
آئے ، تم پر ہوئی نگاہ کرم
اب وہ لیتا ہے بےوفائی کے سانس
ہے نیت میں فتور جرم کی پھانس
طعنے تشنے ہیں میرے سب بیکار
میری آہیں بھی اس کے دل پر بار
نہ وہ اگلے سے شوق کے جذبات
نہ وہ پہلی سی بات ، میرے ساتھ
جانتی ہوں کہ بےخطا ہو تم
جرم سے پاک ، پارسا ہو تم
پھر بھی سن‌لو ، تمہیں سناڈالوں
خوبصورت تھی میں اور اب بھی ہوں
اس حرم میں کوئی تمہارے سوا
بن نہیں سکتا راہ کا کانٹا
آگ تن‌من کی ہے مری ہستی
تم کہاں جانو پیار کی مستی
تم ہو اک سرد حسن ، لاحاصل
کیوں کھرچتی ہو اس کا نازک دل
چھوڑ دو اس کو ، ہے مرا گیری
اس کے بوسوں کی آنچ ہے میری
مجھ سے کھائی تو تھیں بڑی قسمیں
لیکن اب دل نہیں رہا بس میں
آرزو ہو کوئی اسے کہ ملال
مدتوں میں رہی ہوں شامل حال
اب نہ گیری ہے وہ ، نہ میں ہمراز
مارڈالیں‌گے مجھ کو یہ انداز
دیکھتی ہو ، ٹپک پڑے آنسو
ہوں تمہارے حضور دوزانو

تم کو الزام دوں ، مجال نہیں
ہاں یہ ہے التجا ، سوال نہیں
بخش دو وہ خوشی ، وہ دل کا قرار
پھیر دو گیری ، اس کا پچھلا پیار
ہے وہ میرا ہی ، مان لو لیکن
اس کو کچھ سوجھتا نہیں تم بن
دل دکھا کر ، جھڑک کے ، کہہ سن کے
پھیردو جیسے چاہو اپنے سے
اب قسم کھاؤ (گرچہ القران
دیکھا دیکھی بنا مرا ایمان
ماں تھیں لیکن تمھاری ہم مذہب
میں تو بھولی تمھیں وہ یاد ہے سب)
اسی مذہب کی تم قسم کھانا
گیری میرا ہے، مجھ کو لوٹانا
ورنہ سن رکھو ، ہے زریمہ نام
مجھ سے اب تک پڑا نہ ہوگا کام
ایک خنجر بھی رکھتی ہوں بس میں
خون قفقاز کا ہے نس نس میں ،،

یہ کہا اور ہوئی نگاہ سے دور
دیکھتی رہ گئی وہیں مجبور
ناز پروردہ بے گنہ لڑکی
یہ کٹیلی زباں نہیں سمجھی
پر وہ گدلی سی مشتعل آواز
بن گئی اک عجب بھیانک راز
آنسوؤں میں یا دعا میں نجات ؟
کیا کرے ؟ شرمناک ہے اوقات
آگے ہوتا ہے ، دیکھیے، کیا کیا
نوجوانی میں ہے بھگتنا کیا ؟
داشتہ بن کے کاٹنے ہیں دن ؟
کیسی آتی ہے اس خیال سے گھن

یا الٰہی ، یہ ہو کہ اب گیری
قید تنہائی میں نہ آئے کبھی
بھول جائے کہ تھی کوئی کم بخت
یا یہ قیدحیات ہی یک لخت
ٹوٹ جائے کہ ہو یہ قصہ پاک
ماریا چوم لے خوشی سے خاک
زندگی کے وہ قیمتی لمحے
وقت کے ساتھ اڑ گئے ، نہ رہے
کس کرم کا ہے اب یہ ویرانہ
وقت رخصت ہے ، ماریا — جانا
منتظر ہے سکون کی آغوش
مسکرا کر پکارتے ہیں سروش
. . . . . .
اب نہیں ماریا ، سدھار گئی
وہ یتیمی کے دن گزار گئی
اتنی مدت سے تھی جہاں کی لگن
اپسرا نے وہیں دیے درشن
کیا خبر کس سے پائی قبر کی راہ
روگ یا بےبسی کہ سوتیاڈاہ ؟
ماریا تھی تو یہ بھی تھا کوہل
موت کا گھر بنا ہے رنگ محل
گیری نکلا ، محل ہوا سنسان
پھر ہیں تاتار اور وہی طوفان
غیر ملکوں پہ یورشیں ، یلغار
خون کی پیاس ، جنگ ، ہاہا کار
لیکن اب وہ نہیں ہیں خان کے طور
کوئی شعلہ ہے غم کا یا کچھ اور
عین گھمسان کی لڑائی میں
تول کر تیغ جب کلائی میں
وہ جھپٹتا ہے اپنے دشمن پر
ساتھ دیتا نہیں بدن اکثر

ہاتھ اٹھاتے ہوئے جھجکتا ہے
ہر طرف بےدلی سے تکتا ہے
رنگ فق ، لب پہ آہ ، دل میں گھٹن
گرم اشکوں سے تربتر دامن

رہ گیا ہوکے بےوقار حرم
خان کرتا نہیں نگاہ کرم
اک مخنث کی پاسبانی میں
عورتیں گل گئیں جوانی میں
ہاتھ پتھر تلے ہے ، تن مجبور
تھی زریمہ ، سو وہ بھی پہنچی دور
اس کو پانی میں پھینکنےوالے
پاسبانوں کے منہ پہ ہیں تالے
شاہزادی کی تھی جو آخری رات
اس کو بھی غم سے دے گئی ہے نجات
یوں خطا کچھ بھی ہو زریمہ کی
تھی سزا میں بڑی غضبناکی

جنگ قفقاز کے اٹھے شعلے
سرحدی ملک کر دیے ہولے
روسی دیہات میں تھی امن کی چھاؤں
خان نے پھونک ڈالے گاؤں کے گاؤں
گھوم پھر کر جو آیا ”توریدا“
یاد تھی ماریا ستم دیدہ
اس نے بنوایا سنگ‌مرمر سے
ایک فوارہ جو سدا بر سے
اوپر اسلام کا نشان ہلال
اور صلیب اس کے ساتھ بااقبال
(ویسے حرکت یہ بےتکی ہے ضرور
عقل کا پھیر ہے ، سمجھ کا قصور)
نقش ہیں یادگار تختی پر

گردش روزگار سے بچ کر
کنج میں ہے محل کے فوارہ
چلتا رہتا ہے رات دن دھارا
سرد آنسو ٹپکتے پانی میں
ہجر کا شور ہے روانی میں
جیسے روتی ہے ماں کوئی بےحال
رن میں مارا گیا ہو جس کا لال
سن کے یہ داستان غم انجام
لڑکیوں نے دیا مناسب نام
مختصر لفظ، ماجرا سارا
نام ہے ''آنسوؤں کا فوارہ''

چھوڑ کر میں شمال کی محفل
روز کی رونقوں سے اکتا کر
چل دیا باغچہ سرا کی طرف
اس محل میں ہوا مرا بھی گزر
اونگھتے تھے پڑے ہوئے یہ مکان
صف بصف سب برامدے سنسان
یہ جگہ ہے جہاں کبھی تاتار
جن کی دہشت سے کانپتے تھے دیار
قتل و غارت سے تھک کے آتے تھے
دھوم کی محفلیں جماتے تھے
باغباں اب نہیں ہیں، لیکن باغ
آج بھی دے رہے ہیں ان کا سراغ
چشمے شاداب، لال لال گلاب
بیلیں انگور کی ہیں پیچیدہ
اور دیواریں آج تک زرتاب۔
میں نے دیکھے ہیں کہنہ حجرے بھی
جب برستی تھی فارغ البالی
دن بتاتی تھیں بےبیاں ان میں
پھیرتیں کہربا کی تسبیحیں

میں نے دیکھا ہے ان کا قبرستان
جن میں سوتے ہیں اگلے پچھلے خان
جابجا ہیں بلند لوح مزار
سنگ‌سربر کی جن پہ ہے دستار
کس کی آواز یہ سنائی دی ؟
کیا یہ تقدیر کی صدا گونجی
"کیا ہوئے خان ؟ اب کہاں ہے حرم ؟"
ہے اداسی سے اور کچھ عالم
کوئی آواز تک نہیں آتی
میں یہاں ہوں، خیال اور کہیں
شور فواروں کا، گلوں کی مہک
بیخودی چھا رہی ہے، ہوش نہیں
ذہن بےاختیار، دل دھک دھک
اڑتی پرچھائیں سی نظر آئی
کوئی لڑکی محل میں در آئی
. . . . . .
کس کا سایہ تھا، میں نے کیا دیکھا ؟
دوستو تھا یہ کون جلوہ نما ؟
اتنا نازک کہ بس، بیان نہ ہو
ساتھ ہر دم رہے، نشان نہ ہو
میری آنکھوں پہ چھا گیا یہ کون ؟
کیا یہ ہے ماریا کی روح پاک
یا زریمہ رقابتوں کی ہلاک ؟
سونی بستی میں آ گیا یہ کون ؟

یاد پھر آئی وہ نظر چت‌چور
حسن مٹی کی مورتی کا جمال
پھر چلا ہے اسی کی سمت خیال
دل ملا مجھ جلاوطن کو کٹھور ۔
بس بہت ہو چکا یہ دیوانے
کیوں کھرچتا ہے زخم، ہوش میں آ

خواب تیرے بلائے جان نکلے
حق ادا کر چکا محبت کا
سوچ کب تک یہ پاؤں میں زنجیر ؛
تیرے پرشور ساز کی جھنکار
ہوگی رسوا یونہی سر بازار ؟
میں سکون و سخن کا شیدائی
شہرتیں اور چاہتیں تج کر
پھر ہوں دیدار کا تمنائی
ساحل ”سالگیر“* ، خوش منظر !
دل میں بھر کر ڈھکی چھپی یادیں
آرہا ہوں تری چٹانوں پر
”تاوری“** کو ترس گئیں آنکھیں
اے سمندر کے ہم نشیں پتھر ۔
وہ طلسمی فضا ، نظر کا سرور
جھنڈ پیڑوں کے ، گھاٹیاں ، ٹیلے
کہربا اور عقیق سے انگور
وہ صنوبر کی چھاؤں ، آب رواں
مرکز حسن ، زندگی کا وفور
کیا مقامات ہیں خدا کی پناہ !
ان کا ہاتھ اور دامن سیاح
صبح جب ڈالتی ہے نرم نگاہ
ان پہاڑوں میں آڑی ترچھی راہ
دوڑ لیتا ہے اسپ خود آگاہ
جابجا چشمے ، سبز پوش ہیں باغ
چار جانب چٹان ”آیوداغ“***

۱۸۲۳ء — ۱۸۲۱ء

---

* سالگیر — کرائمیا کا ایک دریا جو بحرآزوف میں گرتا ہے ۔
** تاوری ، توری ، توریدا یہ سب کرائمیا کے قدیم نام ہیں ، جہاں تاتاریوں کی حکومت تھی ۔ (ظ ۔ ا ۔)
*** آیوداغ — کرائمیا کے جنوبی ساحل کا پہاڑی سلسلہ ۔ (ظ ۔ ا ۔)

بنجارے

بنجارے بھیڑ بھاڑ میں کرتے چہل پہل
بسرابیہ * میں گھومتے پھرتے ہیں دل کے دل
دریا کے آس پاس ہیں ڈیرے تنے ہوئے
کچھ خستہ‌حال رین بسیرے بنے ہوئے
آزاد ہو کے عیش مناتے ہیں من‌چلے
کیسے مزے کی نیند ہے آکاش کے تلے
جلتی ہے آگ چھکڑوں کے پہیوں کے درمیاں
قالین بھی ہیں لٹکے ہوئے کچھ یہاں وہاں
گھروالے سارے سمٹے ہوئے ہیں الاؤ پر
ہو جائے دال دلیہ ، تو مل جائے پیٹ بھر
گھوڑے چھٹے ہیں، پاس کے کھیتوں کی لوٹ ہے
پچھواڑے اینڈتا ہے کہ بھالو کو چھوٹ ہے
اسٹیپی میں یہ آئے تو اک جان پڑ گئی
اور چل دئے جو لاد کے، بستی اجڑ گئی
کنبے کا ہے خیال سبھی کو برا بھلا
ہے صبح چل چلاؤ کو تیار قافلہ
کلکاریاں ہیں بچوں کی ، گانے ہیں ماؤں کے
گھن بج رہا ہے ، کٹتے ہیں اوزار گاؤں کے

لو وہ صدائیں تھم گئیں ! سناٹا ہو گیا
سارا قبیلہ رات گئے ، تھک کے سو گیا
کتے جو بھونکتے ہیں ، لرزتی ہے خامشی
صحرا میں ہنہناتے ہیں گھوڑے کبھی کبھی
انگارے راکھ ہو گئے اک اک الاؤ پر

---

* بلقان کا وہ خطہ جو کبھی ترکوں ، رومانیہ‌والوں اور روسیوں کے درمیان نزاعی رہا ہے ، اس نے بہت جنگیں اور بربادیاں دیکھی ہیں - دوسری جنگ عظیم کے بعد سے سوویت یونین میں شامل ہے - (ظ - ا -)

آکاش میں ہے چاند، اجالا پڑاؤ پر
اس ٹھنڈی چاندنی میں ہے بوڑھا کوئی اداس
ڈیرے میں اپنے، بجھتے ہوئے کوئلوں کے پاس
میدان پر ہیں بوڑھے کی آنکھیں لگی ہوئی
اور رات کی مہک میں فضا ہے بسی ہوئی
بیٹی کا انتظار ہے ، کیا جانے ، کب پھرے
گھر سے گئی تھی گھومنے پھرنے کے واسطے
نچلا نہ بیٹھا جائے کہ ہے چلبلا مزاج
آزادیوں کی گود کا پالا ہوا مزاج
پچھلا پہر ہے رات کا ، ڈھلتی ہے چاندنی
وہ دور بادلوں سے پھسلتی ہے چاندنی
زیمفیرا کا پتہ نہیں اب تک ، گئی کہاں !
ٹھنڈی پڑی ہیں باپ بچارے کی روٹیاں ۔

وہ دیکھو آرہی ہے ، وہی ہے مگر کوئی
سائے سمان ساتھ میں ہے کوئی اجنبی
یہ کون نوجوان ہے، آتا نہیں نظر
دونوں لپک کے چلتے ہیں، دونوں کا رخ ادھر
آتے ہی بولی : ”بابا یہ مہمان ہے ، مجھے
ٹیلے کے پیچھے مل گیا بس اتفاق سے
میں نے کہا کہ رات یہ ہوجائےگی بسر
خیمے میں چل کے ٹھیر ہمارے پڑاؤ پر
بنجارہ بن کے رہنے کو کہتا ہے ، جیسے ہم
اس کی تلاش میں ہے پولیس ، ناک میں ہے دم
پر میں نے اس کی ہامی بھری ہے نبھاؤں گی
یہ ہے الیکو، اس کو میں اپنا بناؤں گی
ہے دم کےساتھ ساتھ ، جہاں بھی میں جاؤں گی ،،

بوڑھا

مجھ کو خوشی ہے ، آؤ میاں ، ہے تمھارا گھر
ٹھیرو یہیں فقیر کے ڈیرے پہ رات بھر

اور من کرے تو شوق سے رہنا ہمارے سنگ
عادت پڑے گی دیکھ کے اوروں کے رنگ ڈھنگ
تیار ہوں، یہ بوریا بستر ہے، بانٹ لو
جو مجھ کو روکھی سوکھی میسر ہے، بانٹ لو
خانہ بدوش لوگ ہیں، پھرتے ہیں بےلگام
ہم مفلسوں کا دن کو سفر، رات کو قیام
کل صبح تڑکے باجےگا نقارہ کوچ کا
تم بھی ہمارے ساتھ ہی چھکڑے میں بیٹھنا
دھندے بھی ہیں، پسند کرو، سیکھ جاؤگے
لوہے پہ گھن بجاؤگے یا گیت گاؤگے
یا گاؤں گاؤں گھوم کے بھالو نچاؤگے۔

الیکو

میں رہوں گا یہاں۔

زیمفیرا

یہ ہے میرا جواں
کس کی ہمت، چھڑائے بھلا مجھ سے، ہاں!
خیر، اب رات کافی ہوئی
ڈھل گیا چاند بھی
کھیت، میداں، اندھیرے میں گم ہوگئے
میری آنکھوں میں نیندیا گھلی جائے رے...

کٹ گئی رات، اجالا ہوا
اور بوڑھا دبےپاؤں پھرنے لگا
اپنے خاموش خیمے کے چاروں طرف
"جاگ زیمفیرا، اٹھ، دیکھ دن چڑھ گیا
ہوگیا وقت، مہمان، آنکھیں ملو
نرم بستر سے رخصت ہو، بچو، چلو"
لوگ اٹھے نیند سے غل مچاتے ہوئے
کپڑے لتے ٹھکانے لگاتے ہوئے

ڈیرے تہہ کر لئے
اور چھکڑے بھی اوپر تلے بھرلئے
وہ چلی بھیڑ سونے بیابان میں
ایک دو دم کی رونق ہے سنسان میں
آگے آگے چلے جا رہے ہیں گدھے
ان پہ جھولیں کسی اور دونوں طرف
بچے ہنستے، ہمکتے، مزے میں سدھے
پیچھے بڈھے، جواں، سب کے سب مرد و زن
باپ بیٹے، میاں بیوی، بھائی بہن
خوب ہوحق مچاتا چلا قافلہ
اونچی تانیں اڑاتا چلا قافلہ
چیخ بھالو کی، جھنکار زنجیر کی
جھانجھ بجتی ہے ہر بار زنجیر کی
دھاریاں شوخ، چتھڑے لگے پیرہن
بچوں بوڑھوں کے ننگے دھڑنگے بدن
ساتھ کتے بھی ہیں،
بھونکتے ہوکتے، دم نچاتے ہوئے
اور چھکڑے چلیں چرچراتے ہوئے
منچلے بھی نفیری بجاتے ہوئے
کیسا افلاس ہے، کس قدر ابتری!
ان کی ایک اک ادا میں ہے وحشت بھری!
پر مچلتا ہے یوں زندگی کا لہو
ہم جو شہروں کے باسی ہیں
سردار عیشوں پہ قربان ہیں
اس ابلتی ہوئی، ہمہماتی ہوئی زندگی کے لئے
اس قدر اجنبی اور انجان ہیں
جیسے گانے غلاموں کے بےرنگ وبو

الیکو ہے چپ دیکھتا جا رہا ہے
کہ میدان پیچھے چھٹا جا رہا ہے
کہیں دھول میں گم ہوا جا رہا ہے

کوئی جیسے چٹکی سی لیتا ہے دل میں
نجانے یہ کیا درد ہے، کیا ہے دل میں!
یہ زیمفیرا، میری سیہ چشم آہو
مرے پاس بیٹھی ہے، بازو میں بازو
مجھے کونسا غم ہے، دکھڑا کہاں کا
میں آزاد شہری ہوں سارے جہاں کا
مرے سر کے اوپر چمکتا ہے سورج
بھری دو پہر میں دمکتا ہے سورج
ہے آزاد دنیا، مگر میرے جی کو
ہوا کیا؟ ترستا ہوں اب بھی خوشی کو!

پنچھی ہے آزاد چمن میں؛
کیسی فکر، کہاں کا دھندا
اڑنا پھرنا ہر آنگن میں
رس بس کر کیا کرنا ہے، جو
تنکے چن چن چھپر چھائے
ہے وہ رین بسیرا اس کا
جس ٹہنی پر آنکھیں میچے
جس ٹہنی پر نیند آجائے
جب سورج کی لال کٹوری
نکلے اور اجالا چھلکے
پنچھی اپنے رب کا کلمہ
سن کر جھومے ہلکے ہلکے
چہکے اور بھجن خودگائے
جب رت بدلے، آئے گرمی
اور بہاروں کی سب نرمی
دھوپ میں جھلسے، پیاس سے پھڑکے
اور پھر جب دن ہوں پت جھڑ کے
بادل گرجیں، بجلی کڑکے
آدمی کتنے دکھ بھرتا ہے،
سردی، گرمی، آندھی، پانی

سب کے ساتھ گزر کرتا ہے
لیکن پنچھی کیوں غم کھائے
پھر سے اچھی رت آنے تک
دور سمندر پار اڑ جائے
کون اسے رکھے بندھن میں
پنچھی ہے آزاد چمن میں

چلا وہ بھی فکروں سے آزاد ہوکر
زمانے کی کھائے ہوئے سخت ٹھوکر
نہ وہ آشیانے کی راحت کو جانے
نہ دنیا کی اچھی بری لت کو جانے
جو جانے تو آزاد فطرت کو جانے
الیکو پہ ہر سمت راہیں کھلی تھیں
گھنی چھاؤں کی نرم باہیں کھلی تھیں
صبح آنکھ کھلتی تو بےفکر ہوکر
یونہی اپنا دن چھوڑ دیتا خدا پر
تن آسانیوں کی میسر تھی راحت
جو ہوتا ہے ہوتا رہے ، اس کو کیا ڈر ۔
کبھی بیٹھے بیٹھے خیال ایسے آتے :
وہ گزرا ہوا نازونعمت کا ساماں
وہ عشرت کے دن ، جھوٹی شہرت کا ساماں
ستارے وہی دور سے ٹمٹماتے
سفر میں کبھی یوں بھی ہوتا کہ سر پر
کڑکتی تھی بجلی، گرجتے تھے بادل
مگر نیند بےفکر تھی ہر بلا سے
نہ راحت کی پروا ، نہ خطرے سے بیکل
ہے تقدیر اندھے کی لاٹھی — مگر اس
پہ تقدیر کا زور چلتا نہیں تھا
نجانے کہاں کی بھری تھیں امنگیں!
دل آزادیوں میں بہلتا نہیں تھا
کہ سینے میں رہ رہ کے اٹھتی تھیں لہریں

سمے کٹ رہا تھا کسی کش‌مکش میں
اگر چین پایا تو کیا چین پایا ،
کہیں حسرتوں نے جو پھر سر اٹھایا !

زیمفیرا

سچ کہیو، میری جان ، تجھے غم نہیں ہے کیا ؟
اس کا جو عمر بھر کےلئے تو نے تج دیا ؟

الیکو

کیا تج دیا ہے میں نے ، سنوں تو سہی بھلا ؟

زیمفیرا

اپنے وطن کے ، شہر کے سب لوگ اور کیا !

الیکو

کاہے کا رنج ؟
تو نے تو سوچا نہیں کبھی
میری طرح جو کاش کہیں تو بھی جانتی !
کیا چیز ہے گھٹے ہوئے شہروں کی زندگی !
ہر سمت ریل‌پیل ہے ، لاچار ہیں وہ لوگ
جنگلے کھڑے ہوئے ہیں گرفتار ہیں وہ لوگ
سانس ان کے آشنائے نسیم سحر نہیں
پھولے اگر بسنت تو ان کو خبر نہیں
آتی ہے عاشقی کے چلن سے حیا انہیں
اور غور و فکر کا بھی نہیں حوصلہ انہیں
آزادیوں کا مول ہے زنجیر اور زر
ہر بت کے آگے ٹیکتے رہتے ہیں اپنا سر
کیا تج دیا ہے ؟ ان کی یہی بے وفائیاں
وہ جوڑ توڑ اور دلوں کی برائیاں
دیوانےپن سے ان کی دھکا پیل اور ہجوم !
کیا ذلتوں کی شان ہے ! بدنامیوں کی دھوم !

زیمفیرا

پر کیسے شاندار محل ہیں کھڑے ہوئے
قالین بھی ہیں رنگ برنگے پڑے ہوئے
ہیں دعوتیں بھی زور کی، تفریح بھی گھنی
اور لڑکیاں بھی پھرتی ہیں کیسے بنی ٹھنی!

الیکو

کس کام کے یہ جشن، یہ شہروں کی دل لگی
جب پریم ہی نہ ہو تو کہاں کی ہنسی خوشی!
اور لڑکیوں کی بات نہ کر ... ان کا کیا شمار
تو ان سے لاکھ اچھی ہے، بےہار، بےسنگار
آرائش جمال کی حاجت نہیں تجھے
موتی ہے، موتیوں کی ضرورت نہیں تجھے
ہاں، شرط یہ ہے، دیکھ بدل جائیو نہ تو!
بس، میری جان، ایک یہی دل میں آرزو!
چاہت میں تو شریک ہو، راحت میں پاس ہو
پھر روز کا یہ گھومنا پھرنا بھی راس ہو۔

بوڑھا

یوں تو پیدا ہوئے تھے امیروں میں تم
ہم سے الفت ہوئی،
ہم غریبوں میں آئے، لگایا گلے
پر نہیں راس آتی ہیں آزادیاں
اس کو جو عیش میں، راحتوں میں پلے
ایک قصہ سناؤں،
جو ہم نے بڑوں کی زبانی سنا
رہنےوالا کوئی دھوپ کے دیس کا*

---

* یہ رومن شاعر اوویدیم کا قصہ ہے جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے اور جس کو شہنشاہ آوگوستس نے بحیرۂاسود کے ساحل

شاہ کے حکم سے جب نکالا گیا
تو اسے بھی ٹھکانا ملا تھا یہیں
(نام تھا کچھ بھلا سا
مگر اب مجھے یاد آتا نہیں)
تھی بہت عمر لیکن جوان آتما
میل سے پاک، زندہ، سہان آتما
اپنے گیتوں سے جادو جگاتا تھا وہ
اور گلے میں کچھ ایسی کرامات تھی
جیسے چشمے ابلتے ہوں
جھرنے اچھلتے ہوں
جس وقت گانے پہ آتا تھا وہ۔
تھا بھلا آدمی، چاہتے تھے سبھی
ٹھیس پہنچی نہ اس سے کسی کو کبھی
وہ بھی ڈنیوب کے ساحلوں پر یہاں
خوب قصے کہانی سناتا رہا
گیت گاتا رہا، من لبھاتا رہا
اس کو آتا نہ تھا کام دھندا کوئی
بالکوں کا سا کمزور، نازک بدن
اور شرمیلاپن
اپنے بیگانے کرتے تھے سارے جتن
اس کی خاطر کبھی جانور مارلاتے
کبھی مچھلیاں کھیپ میں لے کے آتے
جو پڑتی تھی سردی تو تھمتا تھا دریا
بگولے اٹھاتی تھی برفیلی آندھی
ٹھٹھرتے تھے سب لوگ، جمتا تھا دریا
تو اس دھان پان اور دھرماتما کو
روئیں دار کھالیں اڑھاتے تھے لاکر

پر جلاوطن کردیا تھا۔ اٹلی جنوبی ملک ہے اس لئے اسے دھوپ کا دیس کہا گیا ہے۔ پوشکن نے کئی موقعوں پر اس کا ذکر کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

نکلنے نہ دیتے تھے سردی میں باہر
مگر ان غریبوں کی اوقات کیا تھی!
جو کرتے تھے خاطر مدارات کیا تھی!
کبھی اس کو فکروں کا جیون نہ بھایا
خوشی سے کبھی ان میں رہنے نہ پایا
وہ کانٹا ہوا اور بھی سوکھ کر
یہ کہتا پھرے جابجا دربدر
گناہوں کی یہ مل رہی ہے سزا
کہ قہر خدا مجھ پہ نازل ہوا
اسی آس میں وہ رہا رات دن
کہ شاید نظر ہو مرے حال پر
کہ شاید نکل آئے کوئی مفر
بڑے دکھ سہے اس نے ڈنیوب کے
ساحلوں پر ہمیشہ بھٹکتا رہا
اس کو یاد وطن نے رلایا بہت
زندگی بھر یہ کانٹا کھٹکتا رہا
آخری وقت یہ کی وصیت کہ تم
بعد مرنے کے میری دکھی ہڈیاں
بھیج دینا دکن کی زمیں کو ، جہاں
جیتے جی لوٹ جانے کی حسرت رہی
روح بےچین تھی ، اس کو پردیس میں
زندگی کیا ، گوارا نہ تھی موت بھی

الیکو

ہاں تو اے روم ، اے نامور سلطنت !
تیرے بیٹوں کی تقدیر تھی کیا یہی ؟
تیرے بیٹوں نے صدمے اٹھائے بہت !
اے محبت کے نغمہ سرا
دیوتاؤں کے گن گانےوالے بتا
شان کیا چیز ہے ، نیکنامی ہے کیا ؟
کیا وہ شہرت کہ دنیا قصیدے کہے ؟

تذکرہ نسل درنسل چلتا رہے ؟
یا یہ حالت کہ بےساختہ داستاں
کوئی بنجارہ کرتا ہے خود سے بیاں
چھولداری کے اندر گھٹا ہے دھواں ؟

چکر لگاتے، گھومتے دو سال ہوگئے
خانہبدوش اپنا وہی قافلہ لئے
پھرتے ہیں جابجا؛
اب بھی وہ چلتے چلتے کہیں ٹھیر جاتے ہیں
مہمان بن کے رہتے ہیں ، آرام پاتے ہیں -
گھلمل گیا ہے ان میں الیکو بھی، اب اسے
تہذیب ناگوار، تمدن ہے ناپسند ؛
وہ بیڑیاں بھی کٹ گئیں، آزاد ہوگیا
افسوس ہے کسی کا ، نہ ہوتا ہے فکرمند
اب بھی وہی الیکو ہے ، کنبہ بھی ہے وہی
بیتے دنوں کی یاد بھی آتی نہیں کبھی
بنجارہ بنکے رہنے کی عادت سی ہوگئی
اس کو وہ ان کے رین بسیرے پسند ہیں
اور یہ نشہ کہ کام سدا چین سے چلیں
سنگیت میں رچی ہوئی بھاشا غریب ہے
وہ بھی اسے پسند ہے، دل سے قریب ہے -
بھالو ہے یوں تو غار کا ، جنگل کا جانور،
لیکن اب اس کے ڈیرے میں سوتا ہے پھیلکر
میدان میں سڑک کے کنارے جو گاؤں تھے
مولداویہ کے لوگ بسے تھے یہاں وہاں
ان کے گھروں کے پاس جہاں ڈگڈگی بجی
وہ دوڑے اور چار طرف بھیڑ لگ گئی
بھالو انھیں دکھائے تماشے جہاں تہاں
غرائے اور پنجوں پہ ناچے بھدر بھدر
زنجیر کو چبائے، بھنبھوڑے کسی قدر -
بوڑھا بھی ڈھیلے ہاتھ سے ڈفلی بجا بجا

لاٹھی کی ٹیک لے کے بڑھے کانپتا ہوا
گاتا الیکو ریچھ کی رسی سنبھال کے
زیمفیرا گاؤں گھومتی اور گھر کو لوٹتی
جو کچھ کسی نے دے دیا جھولی میں ڈال کے؛
جب رات ہونے آئے تو وہ تینوں بیٹھ کر
دلیہ کوئی ابالتے موٹے اناج کا
بوڑھے کی آنکھ لگتے ہی، بتی بجھا کے سب
سو جاتے تھے کہ انت ہوا کام کاج کا

آئی بہار، دھوپ میں بیٹھے ہوئے ادھر
ٹھنڈے لہو کو سینک رہے ہیں بڑے میاں؛
اور جھولنے کے پاس ہے بیٹی مگن یہاں۔
گاتی ہے ایک گیت جسے سوچ سوچ کر
اڑنے لگیں الیکو کے منھ پر ہوائیاں

زیمفیرا

میرے بڈھے خصم،
میرے ظالم خصم،
چاہے خنجر چلا
چاہے زندہ جلا
میں ہوں پکی بڑی،
تجھ سے ڈرتی نہیں
چاہے ٹکڑے اڑا، چاہے کر دے بھسم
میرے بڈھے خصم!
اب تو بھاتی نہیں،
تیری صورت مجھے
کیا کروں ہوگئی
تجھ سے نفرت مجھے
اب کسی اور سے
ہے محبت مجھے
جان دے دوں گی، کیا جان کا مجھ کو غم
میرے بڈھے خصم!

الیکو

خاموش، تیرے گیت سے میں تنگ آ گیا
مجھ کو نہیں پسند یہ گانے الا بلا

زیمفیرا

تجھ کو نہیں پسند، نہ ہو، مجھ کو اس سے کیا
میں گا رہی ہوں اپنے لئے، واہ وا جی وا !
... چاہے خنجر چلا، چاہے زندہ جلا
میرے بڈھے خصم، میرے ظالم خصم
کچھ بتاؤں نہ میں
دوں نہ اس کا پتہ
میرے بڈھے خصم!
وہ بہاروں سے بھی بڑھ کے ہے تازہ دم
اور گرمی کے دن سے بھی گرما گرم
ہائے کیا ویر ہے، کیسا کڑیل جواں
پیار بھی جی سے کرتا ہے اس کی قسم
میرے بڈھے خصم
رات سنسان تھی
پیار کرتی رہی
میں اسے، وہ مجھے
خوب ہنستے رہے
تیرے اجڑے ہوئے پکے بالوں پہ ہم
میرے بڈھے خصم !

الیکو

زیمفیرا، بس خموش، مرا ناک میں ہے دم

زیمفیرا

کیوں، کیا ہوا، سمجھ گئے تم، کیوں برا لگا ؟

الیکو

زیمفیرا !

زیمفیرا

مرضی تمھاری، روٹھنا چاھو تو روٹھ لو
میں گاؤں گی، یہ گیت ھے تم پر، جو ھو، سو ھو
(اٹھی وھاں سے، گیت وہ گاتی ھوئی چلی)

بوڑھا

ھاں، یاد آگیا، مجھے اب یاد آگیا
گانا ھمارے وقت میں تھا یہ گڑھا گیا
کاگول کے کناروں پہ ھوتا تھا جب گزر
مریولا میری بیٹھ کے جاڑوں کی رات میں
بچی کو بازوؤں میں جھلاتی الاؤ پر
اور تھا یہی وہ گیت جو گاتی تھی ساتھ میں
بوڑھا ھوا ھوں، عقل پہ پردے سے پڑ گئے
لیکن یہ بول یاد رھے، دل میں گڑ گئے

رات خاموش ھے، رات کی چاندنی
اس جنوبی افق پر ھے چھٹکی ھوئی
اور زیمفیرا نے باپ کو نیند سے
ھڑبڑا کر اٹھایا کہ ”ابا مرے،
دیکھنا تو، الیکو کو کیا ھو گیا
آہ پر آہ بھرتا ھے، روتا ھے یہ
سانس مشکل سے لیتا ھے، سوتا ھے یہ۔“

بوڑھا

دیکھ، بس چپ رھو،
اس کو مت چھوئیو
میں نے یہ روسیوں سے سنا تھا کبھی
روح سینہ دباتی ھے جب رات کو
تلملاتا ھے سوتا ھوا آدمی،
بیٹھ جا تو مرے پاس،
یہ صبح ھوتے چلی جائےگی۔

زیمفیرا

پر یہ ہولے سے زیمفیرا کہتا ہے کیوں ؟

بوڑھا

خواب میں بھی ہے اس کو تری جستجو
اب اسے ساری دنیا سے پیاری ہے تو

زیمفیرا

مجھ کو اس کی محبت بلا ہوگئی
ہائے، میں کیا کروں ؟
دل یہ کہتا ہے اب اس سے آزاد ہوں
اب تو مجھ کو ... مگر ہائیں، یہ کیا سنا ؟
نام اب کے لیا ہے کسی اور کا۔

بوڑھا

نام کس کا لیا ؟

زیمفیرا

نام کیا ، تم کراہیں سنو تو سہی
دانت بھی کٹکٹاتا ہے توبہ مری
جاؤں ، اس کو جگا دوں ابھی

بوڑھا

مت جگا تو اسے ،
رات‌والی کو مت چھیڑ ، جانے بھی دے
ایک آسیب ہے، خود چلی جائےگی

زیمفیرا

اس نے کروٹ بدل لی ہے، وہ اٹھ گیا
اور مجھ کو بلاتا ہے، جاؤں میں کیا ؟
تم بھی سوجاؤ ابا کہ اب میں چلی

الیکو

تو کہاں تھی بتا ؟

زیمفیرا

باپ کے پاس تھی میں تو بیٹھی ہوئی
تجھ پہ آسیب تھا ، یا کوئی روح تھی
کس قدر نیند میں تھی تجھے بیکلی
دانت بھی پیستا ، کٹکٹاتا رہا
نام لےلے کے میرا بلاتا رہا ۔

الیکو

میں نے دیکھا تجھے خواب میں
میں نے دیکھا کہ میرے ترے درمیاں ...
کیا کہوں ، خواب میں تھا بھیانک سماں

زیمفیرا

ان کو مت مان ،
وشواس مت کر ، برے خواب ہیں

الیکو

میں تو کچھ بھی نہیں مانتا
میرا وشواس ہی اٹھ گیا
خواب کیا، اور باتیں بھی کیا دل نشیں
حد تو یہ ہے، یقین تیرے دل کا نہیں!

بوڑھا

کس بات پر خفا ہے ، دوانہ ہوا ہے کیا ؟
اے نوجوان ، آہ تو بھرتا ہے کیوں سدا ؟
ہیں منچلے یہ لوگ ، یہ سندر ہیں ناریاں
ہے آسمان صاف یہاں ، صاف دل یہاں
مت رنج کر ، کہ رنج میں ہے جان کا زیاں

الیکو

بابا ، وہ اب تو پیار ہی کرتی نہیں مجھے

بوڑھا

زیمفیرا ایک بچی ہے ۔ لے کام صبر سے !
بیکار کے یہ وہم ہیں ، دل سے نکال دے
تو عشق میں دکھی ہے ، جلاتا ہے اپنا جی
عادت ہے عورتوں کو مگر تاک جھانک کی ۔
وہ دیکھ آسمان کی محراب کے تلے
آزاد چاند گھوم رہا ہے مزے مزے
قدرت میں جو بھی چیز ہے ، نزدیک ہو کہ دور
چھلکا کے اپنا جام لٹاتا ہے سب کو نور
جن بدلیوں میں جھانک لیا نور بھردیا
جس کو دکھائی چھب ، اسے دیوانہ کردیا
لواب کے ایک اور ہی بادل سے میل ہے
اور یہ بھی تھوڑی دیر کا دلچسپ کھیل ہے
کس کی مجال ہے جو کہے ٹھیرجا یہیں
یہ چاند روک ٹوک کوئی مانتا نہیں
ان لڑکیوں کا دل بھی کہاں حکم سہ سکے
تم ایک ہی سے پیار کرو ، کون کہہ سکے
لے کام صبر سے !

الیکو

کتنا وہ چاہتی تھی مجھے
کیا ہوا وہ دل ؟
جو سونی وادیوں میں دھڑکتا تھا مستقل
کتنی ہی بار شوق سے سینے کے متصل
باہیں گلے میں ڈال کے راتیں گزاردیں
کتنی ہی بار ، جب اسے سوجھا ہے بچپنا
تتلا کے اور پیار کی باتیں بنا بنا
بوسوں سے مست کرکے کیا سوچنا منع

الجھے ھوئے خیال کی زلفیں سنوار دیں
زیمفیرا میری اب وہ نہیں ھے ، بدل گئی
وہ آنچ سرد ھوگئی ، مستی نکل گئی

بوڑھا

سن ، تجھے آپ بیتی سناتا ھوں میں :
ھے پرانی بہت ، ایک عرصہ ھوا
یوں سمجھ لو کہ ڈنیوب پر ان دنوں
ماسکو وال کا کوئی خطرہ نہ تھا
(دیکھتے ھو ، مجھے یاد آنے لگی
وہ پرانی کہانی ، بڑی دکھ بھری)
ھم لرزتے تھے ترکی کے سلطان سے
پادشا کی حکومت تھی بوجاک پر
حکم چلتا تھا اونچے اکرمان * سے
وہ مری نوجوانی کے دن تھے ؛ ابھی
گھنگھریالا کوئی بال پکا نہ تھا
روح تھی شاد ، آباد ، مستانہ تھا
تھیں حسینائیں بھی ایک سے ایک ور
ان میں بس ایک پر جاکے ٹھیری نظر
اس کو تکتا تھا ، بھرتا تھا اس کا ھی دم
جیسے سردی میں سورج کو تکتے ھیں ھم
رات دن التجا سے منایا اسے
آخر اک روز اپنا بنایا اسے

ھائے میری جوانی کے پر لگ گئے
کوئی تارا تھا ، گم ھوگیا دن بھئے
اور محبت کی رت بھی بدا ھوگئی
وہ جوانی سے پہلے ھوا ھوگئی

---

* بوجاک — بسرابیہ علاقے کا جنوبی حصہ - بسرابیہ کا شہر اکرمان ۱۸ ویں صدی میں ترکی کا قلعہ تھا - (ایڈیٹر)

سال بھر کی محبت میں جی بھر گیا
میری مریولا تو کیا سے کیا ہوگئی

اب سنو ، کیا ہوا :
ہم تھے کاگول کے پاس ٹھیرے ہوئے
تھے پہاڑوں کے دامن میں ڈیرے لگے
اس طرف سامنے سے کوئی قافلہ
آن پہنچا تو وہ بھی وہیں ٹک گیا
وہ بھی اپنے ہی بنجارے تھے ذات کے
بن گئے وہ بھی ہمسائے دو رات کے
تیسری رات کو وہ سدھارے سبھی
اور مریولا بھی ان کے پیچھے گئی
اپنی ننھی سی بچی کو گھر چھوڑ کر
مجھ کو سوتا ہوا بےخبر چھوڑ کر ؛
جب سویرا ہوا ، آنکھ میری کھلی
دیکھتا ہوں کہ سب کچھ ہے ، پر وہ نہ تھی
اس کو آواز دی — پوچھتا بھی پھرا
پر نہ پایا کہیں کوئی اس کا پتا
روئی زیمفیرا میری بلک کر تو میں
خود بھی رویا — کہ آخر ہم انسان ہیں
دیکھ لو وہ دن اور آج کا ہے یہ دن
ہوگئی ساری دنیا کی عورت سے گھن ؛
پھر کسی سے کبھی دل لگایا نہیں
اپنی بیٹی کو پالا ، اکیلا رہا
اور سے میں نے دکھ سکھ بٹایا نہیں
اپنے جیون کا ساتھی بنایا نہیں

الیکو

پر تم نے اس رذیل کا پیچھا کیا نہ کیوں ؟
اس بےوفا کا اور درندے کا ایک ساتھ
خنجر سے پاش پاش کلیجہ کیا نہ کیوں ؟

بوڑھا

مگر کاہے ؟
جوانی پنچھیوں سے بھی زیادہ شاد ہوتی ہے
بہت آزاد ہوتی ہے
محبت پر، مرے پیارے، کسی کا بس نہیں چلتا
خوشی ملتی ہے سب کو باری باری
آج میری، کل تمھاری،
یہ دیا ایسا ہے جو بجھ جائے تو پھر سے نہیں جلتا

الیکو

مجھ میں نہیں یہ تاب کہ تکرار چھوڑ دوں
خاموش بیٹھ جاؤں، ادھیکار چھوڑ دوں
یا خود نہ جوڑ توڑ کروں اپنے کام کا
یا بس چلے تو لطف نہ لوں انتقام کا
دشمن جو سو رہا ہو سمندر پہ بےخبر
اور اتفاق سے ہو مرا اس طرف گزر
ماتھے پہ بل نہ آئے، نہ دل میں دیا کرم
ٹھوکر لگاؤں اس کو وہیں پر خدا قسم
پانی پہ جاکے دور گرے اور اچھل پڑے
اک دم جو اس کی چیخ نکل جائے خوف سے
میں زہر میں بجھا کے لگاؤں وہ قہقہے
جو اس کے ڈوبنے کو تماشا بنا بھی دیں
اور زندگی میں خوب ہنسائیں، مزا بھی دیں

نوجوان بنجارہ

بس ایک پیار اور
سنو، ایک بار اور

زیمفیرا

اب ہوگیا سمے
میرا میاں، بڑا ہی جلاتن ہے، بس کرو

نوجوان بنجارہ

اچھا تو رخصتی کا وہ لمبا سا پیار اور

زیمفیرا

لو، اب تو چھوڑ دو
وہ آ نہیں گیا، یہ غنیمت ہے، بس کرو

نوجوان بنجارہ

یہ تو بتاؤ، کب کو کروں انتظار اور ؟

زیمفیرا

جب چاند چڑھ چکا ہو تو ٹیلے کی آڑ میں
اس قبر پر میں آؤں‌گی، تم آج ہی ملو!

نوجوان بنجارہ

(رات گئے انتظار میں)
بس جی، وہ اب نہ آئےگی، باتیں بنا گئی

زیمفیرا

اے، میری جان دوڑ کے آ، لے میں آگئی

سو رہا تھا الیکو، پر الجھے ہوئے
خواب نے اس کو چونکا دیا نیند سے
چیخ ماری، اندھیرے میں گھبرا گیا
سہج سے ہاتھ پھیلا کے بڑھتا گیا
بدگمانی میں اس نے ٹٹولا کہیں
سرد بستر تھا، بستر کی رونق نہیں ...
وہ تڑپ کر اٹھا اور سننے لگا
ہر طرف ہو کا عالم تھا، سنسان تھا
مارے دہشت کے لرزہ ہوا، تپ چڑھی
اس کو چھوٹے پسینے، بڑھی کپکپی

اٹھ کے ڈیرے سے باہر گیا اور وہاں
اس نے چھکڑوں کے چکر لگائے کئی
گھپ اندھیرا تھا ، وحشت تھی ، سونا سماں
کھیت چپ‌چاپ لیٹے ہوئے بے‌زباں
چاند ہالے میں تھا ، کہر میں چاندنی
ملگجا نور تاروں کا چھٹکا ہوا
سرد شبنم پہ ابھرے ہوئے نقش پا
وہ نشان اس کو رستہ دکھاتے چلے
بیقراری سے اس سمت بڑھتا گیا
دور ٹیلے کے پیچھے جہاں لے‌چلے

دور سے کچھ سفیدی سی آئی نظر
راہ کی تان ٹوٹی کسی قبر پر
پاؤں بے‌جان تھے ، دل پریشان تھا
ہول آتا تھا ماتھا ٹھنکنے سے بھی
اس کے ہونٹوں پہ ، گھٹنوں میں تھی تھرتھری
جاکے دیکھا تو — یہ کیا ؟ یہ کیا ہے ؟ یہ کیا ؟
کوئی سچ‌مچ کی ہے بات یا خواب سا ؟
قبر کی ہو رہی ہے یہ بے‌حرمتی!
اس پہ بالکل ہی نزدیک ہیں سائے دو
اور چپکے سے جیسے کوئی بات ہو ۔

پہلی آواز

اب وقت ہوگیا —

دوسری آواز

تو زرا ٹھیر جا

پہلی آواز

اب وقت ہوگیا مرے پیارے

دوسری آواز

نہیں نہیں
کچھ اور ٹھیرجا کہ نکل آئے دن یہیں

پہلی آواز

اب دیر ہو چکی ہے پرے ہٹ

دوسری آواز

کچی ہے تیری چاہ ، زرا ٹھیر اک منٹ !

پہلی آواز

میرے میاں کی آنکھ اگر کھل گئی تو پھر ؟

الیکو

لو ، آنکھ کھل گئی،
دیکھوں تو مجھ سے بچ کے نکلتے ہو اب کہاں؟
اچھے رہے کہ قبر بھی تیار ہے یہاں۔

زیمفیرا

تو میری جان بھاگ لے جلدی سے، بھاگ، بھاگ

الیکو

او نوجوان ، ٹھیر ، بجھاتا ہوں تیری آگ!
(چاقو اٹھاکے سینے میں پیوست کردیا)

زیمفیرا

یہ کیا الیکو ؟

نوجوان بنجارہ

ہائے رے میں مرا

زیمفیرا

یہ کیا ستم ہے، تو نے الیکو، یہ کیا کیا ؟
چھینٹے اڑے ہیں، خون میں ڈوبا ہوا ہے تو
مارا ہے اس کو جان سے ظالم، برا کیا

الیکو

تو بھریو دم اب اس کی محبت کا ، کیا ہوا

زیمفیرا

بس، ہوش میں ہو، رعب نہیں مانتی ترا
ڈرتی نہیں ہوں تجھ سے ، خبردار، دور ہو !
ان دھمکیوں پہ ، قتل پہ پھٹکار، دور ہو !

الیکو

مرنا ہے تجھ کو بھی!
(اس پر بھی ایک وار کیا)

زیمفیرا

ہائے — محبت میں جان دی ۔

مشرق کی صبح ہوتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
قاتل نے رات کاٹ‌دی سنگ مزار پر
ٹیلے کے پار، ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے
چہرے کا رنگ زرد ہے، کپڑے لہو میں تر ،
لاشیں نظر کے سامنے دونوں دھری ہوئی
چاروں طرف سے بھیڑ ہے دہشت بھری ہوئی
بنجارے بدحواس ہیں، اور لب سیے ہوئے
روتی ہوئی، قطار میں آتی ہیں عورتیں
لاشوں کی آنکھیں چومتی جاتی ہیں عورتیں
بیٹھا ہے اک طرف کو اکیلا ضعیف باپ
کڑیل جواں کی لاش کو تکتا ہے درد سے
چپ چپ ہے، ہاتھ پاؤں ہیں بےجان سرد سے
دونوں جنازے ساتھ اٹھے، موت نے انہیں
ٹھنڈی زمیں کی گود میں لاکر لٹا دیا
دونوں جوانیوں کو برابر لٹا دیا ۔
سب کچھ الیکو دور سے دیکھے گیا خموش
دینے لگے جب آخری مٹی تو اس نے سر

آهسته سے جھکایا ، گرا خود بھی خاک پر ۔
نزدیک آکے بوڑھے نے تب اس سے یوں کہا :
'' پیچھا ہمارا چھوڑدے او خود پسند جا!
ہم لوگ جنگلوں میں پلے ہیں، ہمارے ہاں
قانون ہے، سزا ہے، نہ پھانسی، نہ سختیاں
آہیں نہ لیں، نہ خون کسی کا بہائیں ہم
پر خونیوں کے سائے سے دامن بچائیں ہم
آزاد زندگی کے نہیں ہیں یہ راستے
آزادی تجھ کو چاہیے صرف اپنے واسطے
تیرا خمیر اور ہے ، راس آئےگی نہیں
یہ سادگی کہ جس میں بناوٹ کوئی نہیں
تو ساتھ ہوگا تو تری آواز آئےگی
گزرےگی ناگوار، بہت دل دکھائےگی
ہم دل کے صاف لوگ ہیں، ہم میں سہار ہے
تو بدمزاج شخص ہے، بےاعتبار ہے
تیرا ہمارا ساتھ نہیں، جا معاف کر
وہ تیرا راستہ ہے، مبارک تجھے سفر ،،

یہ کہہ چکا تو چلنے کو خیمے اٹھا لیے
وہ خوفناک رین بسیرا اجاڑکے
بنجارے سارے شور مچاتے ہوئے چلے
جب لادکر وہ چل دئے، بستی اجڑ گئی
اجڑی زمیں پہ اور بھی کچھ گرد پڑگئی
میدان نامراد رہا، اس میں کیا بچا
چھکڑا پھٹے پرانے سے قالین کا بچا
وہ حال جیسے بھور دھندلکے میں ہو کبھی
سردی شروع ہونے میں دوچار دن رہے
کھیتوں سے اڑکے جاتے ہیں سارس رہے سہے
کرتی ہے رخ جنوب کو ان کی سفید ڈار
بازو ہوا میں، چیخ فضا میں، دلوں میں پیار
گولی لگے کسی کے تو گرتا ہے ٹوٹ کر

اپنے سفر نصیب رفیقوں سے چھوٹ کر
شہپر کا زخم پاؤں کی زنجیر ہے اسے
تنہائی ایک موت کی تصویر ہے اسے
اب رات آئی، رات کا اجڑا سہاگ ہے
چھکڑے میں روشنی ، نہ انگیٹھی میں آگ ہے
گزرےگی کیسے رات چڑھی چھت کے سائے میں
سونا کہاں کا ، آنکھ بھی لگنے نہ پائےگی
تنہائی اس کو خون کے آنسو رلائےگی

خاتمہ

جادو ہے کوئی شاید اس نغمہ سرائی کا
جس نے مری یادوں میں
بھولے ہوئے چترون کو رہ رہ کے ابھارا ہے
دکھ سکھ کے وہی منظر ، وہ دھند، وہ اجیالے
آئے ہیں تصور میں، خوابوں نے پکارا ہے
اس ملک کی یاد آئی *
جس ملک میں مدت تک اٹھے ہیں بہت فتنے
گونجے ہیں بہت نعرے
جس ملک میں طاقت سے مجبور ہوا ترکی
روسی نے نئی سرحد منوا کے دکھادی ہے اک شان بہادر کی
دو سر کا وہی شاہیں ** کرتا ہے صدا اب بھی
گزری ہوئی عظمت کا دیتا ہے پتہ اب بھی
اس ملک کے چٹیل سے میدان میں بنجارے
آثار قدیمہ کی سرحد سے گزرتے ہیں

---

* اشارہ ہے بسرابیہ کی طرف جہاں پوری اٹھارویں صدی میں روس اور ترکی کےدرمیان لڑائی چلتی رہی - ۱۸۱۲ ء میں بسرابیہ روس کو مل گیا اور یہاں سرحد قائم ہوئی - (ایڈیٹر)

** روس کی زارشاہی کا سرکاری نشان - (ایڈیٹر)

دیکھے ہیں بہت میں نے
ان خانہ‌بدوشوں کے بے‌رنج و ضرر چھکڑے
بچوں کی طرح خوش خوش بھرتے ہیں یہ طرارے
کیا شوخیاں کرتے ہیں!
سنسان بیاباں میں اکثر یہ ہوا، میں بھی
اس بھیڑ میں جا پہنچا، کچھ دور چلا میں بھی :
جو رزق ملا کھایا
جو آگ ملی تاپی
ایسی بھی کٹیں راتیں
تکیہ نہ کوئی بستر
بس سوگئے کھاپی کر
وہ رینگنا چھکڑوں میں، جی کھول کے وہ گانا، مجھ کو بھی پسند آیا
سنگیت کی سرمستی، انداز وہ مستانہ، مجھ کو بھی پسند آیا
سریولا کا نازک سا یہ نام سنا میں نے
اور ایک زمانے تک یادوں میں چنا میں نے
پر صاف کہوں تم سے
قدرت کے، غریبی میں پالے ہوئے، فرزندو!
آزاد منش بندو!
کہتے ہیں خوشی جس کو، تم نے بھی نہیں پائی
وہ راس نہیں آئی!
پیوند لگے ڈیرے راحت کو ترستے ہیں
اور سائے میں ان کے بھی پلتے ہیں بڑے سودی
وہ خواب جو ڈستے ہیں؛
ویران زمینوں پر یہ چلتی چھتر چھایا
انسان نے اس میں بھی دکھ سے نہ مفر پایا
ہر سمت رکی راہیں، ہر سمت کھڑی ہیں یہ کم‌بخت تمنائیں
تقدیر کے حملوں سے تدبیر نہیں بچتی، جائیں تو کہاں جائیں؟

ء ۱۸۲۳

تانبے کا شہسوار

پیش لفظ

جس واقعے کے بارے میں یہ نظم ہے اس کی بنیاد ایک حقیقت پر ہے یعنی سیلاب کی تفصیلات اس زمانے کے رسالوں سے لی گئی ہیں۔ شائقین بیرخ کی کتاب * دیکھ سکتے ہیں۔

تمہید

جہاں منہ زور دھارے ساحلوں کو توڑ دیتے تھے
وہ اپنی سوچ میں گم تھا، کنارے پر قدم رکھے
خیال اونچے، نگاہیں دور، چوڑے پاٹ کا دریا
بدلتا کروٹیں، انگڑائیاں لیتا؛
کہیں اک آدھ خستہ‌حال سی ڈونگی
جھکولے کھاتی جاتی تھی؛
کبھی لہراتی جاتی تھی۔
دھنساؤ تھی زمیں، کائی لگے کچے کناروں کے
ادھر آدھر گھروندے تھے
ٹھکانے گھاٹیوں، کم بختی ماروں کے۔
گھنا جنگل تھا چاروں سمت، سائیں سائیں ہوتی تھی
اجالا دن کا غائب،
دھوپ کہرے میں کہیں منہ ڈھک کے سوتی تھی
خیال آیا اسے:

---

* یہاں مطلب اس کتاب سے ہے جس کا نام ہے ''سینٹ‌پیٹرس‌بورگ کے تمام گذشتہ سیلابوں کی تفصیلی خبریں،، (سینٹ‌پیٹرس‌بورگ، ۱۸۲۶ء) - (ایڈیٹر)

ہم اس جگہ سے سویڈن کا زور توڑیں گے ۔
یہاں بنیاد ڈال جائے گی اک شہر کی اور یہ
اسی مغرور ہمسائے کی ضد پر کرکے چھوڑیں گے
ہمارے حق میں قدرت سے ہوا ہے فیصلہ صادر
کہ کھڑکی کھول دی جائے یہاں یورپ کی سمت آخر ،
کھڑے ہوں ڈٹ کے ہم، رکھیں سمندر پر قدم اپنے
نئی انجانی لہروں میں جہاز آئیں گے اس جانب
ہمارے میہماں بننے کو، لہراتے علم اپنے
جہاں ہے آج جنگل ، کل یہیں منگل منائیں گے
کھلے میدان میں جی کھول کر دھومیں مچائیں گے

ابھی سو سال گزرے تھے کہ یہ نوخیز شہزادہ
دیار نیم شب کے حسن میں ہر شہر سے زیادہ
اندھیرے جنگلوں میں سے
بھبکتی دلدلوں میں سے
نرالی شان سے ابھرا ، ہوا شوخی پہ آمادہ ؛
جہاں سو سال پہلے تک ، وہی ’’ فن ،، قوم کے مچھوے
بہت آفت‌زدہ پھرتے رہے قدرت کے سوتیلے
پھٹے حالوں گزر کرتے رہے نیچے کناروں پر
پرانے جال پھیلاتے رہے ان دیکھے دھاروں پر
وہیں اب جگمگاتی، جاگتی پتھر کی دیواریں
کھڑی تھیں سر اٹھائے اور موجیں ان سے سرماریں
بڑے بھاری محل تھے اور عالی شان مینارین
جہاز ان گودیوں کے رخ پہ آتے تھے زمیں کے کونے کونے سے
جو رونق کی جگہ تھیں اور مالامال سونے سے
ادھر دریائے نیوا کے بدن پر چڑھ گئے پتھر
کمانی‌دار پل ہی پل بنے پانی کی چھاتی پر
جزیروں میں سے گہرے سبز باغوں کے گھنے سائے
بڑھے دریا کے اوپر ہاتھ پھیلائے
بنا یہ پائے تخت ایسا
کہ اس کا سامنا کیسا

پرانی راجدھانی ماسکو یوں ہوگئی باسی
نئی رانی کے آگے
جیسے گہنوں میں لدی پچھلے کسی راجہ کی رنواسی

محبت ہے مجھے تجھ سے، بنایا تجھ کو پیٹر نے
یہ سانچے میں ڈھلے گمبھیر منظر ہیں مجھے پیارے
یہ کس بل تیرے نیوا کے، یہ اس کا شان سے بہنا
کناروں کا پٹاؤ اور چٹانوں کا چڑھا رہنا
یہ گل بوٹوں کے جنگلے اور باڑیں تیری لوہے کی،
یہ راتیں کھوئی کھوئی سی،
یہ دن چھپتے، اندھیرے سے اجالے کی ملاقاتیں،
تری بےچاند کی یہ چاندنی راتیں،
کہ میں کمرے میں جب بےلیمپ کے لکھتا ہوں، پڑھتا ہوں
جدھر دیکھو، حویلی ہی حویلی ہے بڑی بھاری
کھڑی سنسان سڑکوں پر، جھلکتی، نیند کی ماری
ادھر سے ''ایڈمیرلٹی،، کی سوئی روشنی دیتی
اندھیرا رات کا اترے تو کیونکر
ان سنہرے آسمانوں پر
شفق خود ہی بدلتی رہتی ہے اوپر تلے چادر
یہاں شب آدھ گھنٹے کے سوا مہلت نہیں لیتی۔
میں تیرا اور ترے بےرحم جاڑوں کا ہوں متوالا
ہوا جب بند ہوجاتی ہے اور کٹتا ہے جب پالا
اڑے پھرتے ہیں نیوا کے کنارے جن دنوں زن زن
وہ بےپہیے کے تانگے، راس جن کو برف کی پھسلن
تو کتنے خوبصورت لڑکیوں کے گال ہوتے ہیں
دمکتے ہیں، گلابوں سے زیادہ لال ہوتے ہیں
گمکتی، چمچماتی، گونجتی ہے ناچ کی محفل
چھڑے چھانٹوں کی دعوت میں جمع ہوتے ہیں بگڑے دل
انھی میں جھاگ اڑاتے، کھنکھناتے جام آتے ہیں
اگر ''پچ میل،، ہو تو نیلے شعلے کام آتے ہیں
مجھے پیاری ہیں یہ فوجی پریڈیں ''مارسوو میدان،، کی

جہاں پیدل کی رپ رپ اور سواروں کے رسالے بھی
بڑی مردانگی ہے، زندگی ہے ان جوانوں میں!
ہے یک رنگی مگر کیا دل‌کشی ہے ان جوانوں میں!
قدم اپنے ملا کر جب صفیں ہٹتی ہیں، بڑھتی ہیں
اترجاتی ہیں لہروں کی طرح اور پھر سے چڑھتی ہیں
اٹھائے فتح کے پرچم، اڑاتے جھنڈیاں ان کی
چمک اٹھتی ہیں جب تانبے کی فوجی ٹوپیاں ان کی
پڑی ہیں گولیاں ان پر، لڑائی کے نشاں ان کی
یہ جنگی راجدھانی تیرا نظارہ!
دھوئیں کی دھار، توپوں کی گرج، سب کچھ مجھے پیارا
جب آدھی رات کی رانی
محل میں زار کے جنتی ہے بیٹا یوسف ثانی
کہیں سے جب خبر آتی ہے دشمن کو ہرانے کی
سلامی روس کو دیتی ہیں توپیں فتح پانے کی۔
اڑاتا برف کے ٹکڑے
بسنت آنے کی دھن میں جھومتا، دھومیں مچاتا
جب سمندر کی طرف نیوا بڑھا جائے
مجھے اس سے محبت ہے،
مجھے اس شہر کی اک اک ادا پر دل سے پیار آئے۔

نکھر، ہاں شہر پیٹر کے، ترا حسن اور بھی نکھرے!
کھڑا ہو روس کے مانند تن کر
ہاں، جھکیں‌گے تیرے قدموں پر
عناصر اپنی مٹھی میں ہیں، اب رہتے نہیں بکھرے؛
کہو ''فن،، سے کہ وہ اپنی پرانی دشمنی اور قیدیوں کی رٹ
لگانا بھول جائے
آخری آرام میں ہے اس جگہ پیٹر
خبردار، اب کوئی فتنہ یہاں اٹھنے نہ پائے!

اک آفت آئی تھی اس شہر پر ایسی
دلوں میں آج بھی تازہ ہے یاد اس کی...

عزیزو، دوستو! گزری ہوئی بپتا سناتا ہوں۔
دکھے گا دل، مگر میں آپ کو قصہ سناتا ہوں۔

پہلا حصہ

بجھا سا شہر تھا پتروگراد اور سنسناتی تھی
نومبر میں خزاں کی بن بلائی میہماں سردی
مچاتا شور غل، شراٹے بھرتا
اپنی سب حدبندیوں کو پار کرتا
اس طرح نیوا تڑپتا تھا وہاں
جیسے کوئی بیمار بستر پر مچلتا ہے
(جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہے)
اندھیری رات میں بوچھار کھڑکی پر اکھرتی تھی
ہوا اس زور سے چلتی کہ گویا بین کرتی تھی
غرض ایسے میں جب تھا ہر طرف طوفان کا سایا
کہیں مہماں گیا تھا ایوگینی، اپنے گھر آیا
ہم اس کو ایوگینی ہی کہیں گے اس فسانے میں
کہ کانوں کو بھلا لگتا ہے یہ نام اور پھر یوں بھی
قلم میرا رہا مانوس اس سے اک زمانے میں
ضرورت کیا ہے اس کا خاندانی نام لکھنے کی،
کبھی مشہور تھا شاید: کرامزین * کے قلم سے بھی
جگہ اس نام نے پائی وطن کی داستانوں میں
مگر سب بھول بیٹھے، گم ہوا کب کا فسانوں میں۔
ہمارا نوجواں ہیرو
کہیں پر نوکری کرتا ہے

---

* کرامزین (۱۸۲۶ء — ۱۷۶۶ء) مشہور روسی مؤرخ جنھوں نے روس قدیم کی مبسوط تاریخ لکھی ہے۔ اس تاریخ میں مشاہیر کے خاندانوں کے نام بھی آتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

کولوسنا میں رہتا ہے ؛
بڑے لوگوں سے ہے وحشت ، نہ اک لینی نہ دو دینی
نہ غم گزرے عزیزوں کا ، نہ دکھ ماضی کے سہتا ہے

گھر آیا ایوگینی ، کوٹ جھاڑا اور سونے کو
اتارے اپنے کپڑے ، اور گرمی دی بچھونے کو
مگر سو طرح کی الجھن نے گھیرا
دیر تک ہوتی رہی ہلچل خیالوں میں
خیال ایسے کہ خود سوئیں، نہ سونے دیں
کبھی سوچے کہ کیسی مفلسی تھی ، کس قدر مشکل
سے آزادی ملی ہے اور ہوا ہوں میں کسی قابل ؛
کبھی سوچے ، خدا گر مہرباں ہوتا
رقم ملتی، سمجھ ملتی، چنیں ہوتا ، چناں ہوتا
بھلا دیکھو تو ہیں دنیا میں کتنے خوش‌نصیب ایسے
کہ جن کی عقل میں ہے گانٹھ ، لیکن گانٹھ میں پیسے
نہ کچھ کرنا نہ دھرنا ہے، اڑاتے ہیں مزے کیسے!
ادھر میں ہوں کہ ہے دو سال سے بس کام کا چکر ؛
کبھی سوچے کہ موسم کے زرا بگڑے ہیں کچھ تیور
چڑھا آتا ہے پانی
اور نیوا میں ہے طغیانی
عجب کیا جو ہٹائے جا چکے ہوں پل بھی دریا سے
نہ ملنا ہو سکے دو چار دن اپنی پراشا سے۔
جدائی کا خیال آتے ہی دل سے آہ سی نکلی
وہ شاعر کی طرح الجھا تو یہ الجھن بڑی نکلی :
”کروں شادی ؟ مگر کیسا رہے گا ؟
کیوں نہیں ؟ — کرلوں
زرا مشکل تو ہوگی ،
پھر بھی کرنی ہے وہیں ، کرلوں ،
بدن میں جان ہے اور نوجوانی بھی
لگن بھی ہے مجھے دن رات محنت کی
ٹھکانا کوئی اچھا سا سلیقے کا کہیں کرلوں ؛

پراشا کو بسالوں ہو جو اطمینان کی صورت
سجالوں من کے مندر میں اسی دیوی کی اک مورت
برس دن ہونے آئےگا تو تم جانو
کہ گھر میں بال بچہ ہو
ملے تنخواہ ، لاؤں ، اس کو دوں ، وہ جانے گھر جانے
وہی پالےگی بچوں کو، وہی یہ درد سر جانے ...
مزے سے ہاتھ میں ہم ہاتھ تھامے دن گزاریں گے
جب اپنی عمر کو پہنچیں گے دنیا سے سدھاریں گے
نواسے پوتے کاندھا دیں گے، مٹی میں اتاریں گے ... ،،

خیال آتے رہے ، جاتے رہے - اس رات سینے پر
دھرا تھا جیسے اک پتھر
غرض یہ آرزو کرتے
کہ اچھا تھا اگر طوفان ٹل جاتا
نہ یوں غصے میں بارش کھڑکیوں پر سر پٹکتی
اور نہ یوں جھونکے گزرتے
ہائےواویلا مچاتے، تو مرے سینے سے یہ کانٹا نکل جاتا
یہی اک آس دل بہلا گئی آخر
پپوٹے جھک چلے تھے نیند اس کو آگئی آخر -
ڈھلی جب رات طوفانی
تو کچھ ہلکے ہوئے جھونکے
وہ دن نکلا تھپیڑے جس نے کھائے تھے ہواؤں کے
وہ پھیکا دن
مصیبت کا ، غمی کا دن !
بپھر کر رات بھر نیوا نے پٹکا سر
سمندر کی طرف طوفان کی زد پر
مگر ان چیختے چنگھاڑتے دھاروں پہ کیا قابو
ملا رستہ نہ دریا کو، نہ ریلے پر چلا قابو
صبح کو بھیڑ تھی، انبوہ تھا اس کے کناروں پر
تماشا دیکھتے تھے لوگ جھک جھک کر
مزا چھینٹوں کا لیتے تھے

نظارہ کر رہے تھے ان پہاڑوں کا
جنھیں پھرا ہوا پانی اٹھاتا تھا
مگر اتنے میں کھاڑی سے
بڑھے اس زور کے جھونکے
کہ نیوا سامنے کی مار کھاکر ہولیا پیچھے
وہ اپنی رو میں یوں غصے سے بل کھاتا ہوا پلٹا
جزیروں کو ڈبویا اور غراتا ہوا پلٹا
ہوا کچھ اور بھی بگڑی
ادھر موسم نے دی ٹکر
تو نیوا ہو گیا آپے سے باہر
اور ابلتا، کھولتا، چنگھاڑتا یوں شہر پر جھپٹا
بڑھے جیسے کوئی خونی درندہ طیش میں آکر
اسے دیکھا جو یوں بڑھتے ہوئے آگے
کناروں سے سرکر سب کے سب بھاگے
زمیں کے نیچے تہہخانوں میں دراتا بڑھا پانی
تو نہریں سیخچوں سے پھٹ پڑیں اتنا چڑھا پانی
کمر تک پانی ہی پانی تھا، اس میں پیتروپول ایسے
کھڑا تھا، جھومتے جاتے ہوں اندر دیوتا جیسے ...

گھرے نرغے میں، یورش! ہر طرف سے کردیا ریلا
گھسی ہیں کھڑکیوں میں، چور لہروں نے کیا ریلا
پٹیلے دوڑتے ہیں،
ان کے ٹکرانے سے چکنا چور ہیں شیشے
سڑک پر تیرتے پھرتے ہیں:
گلے تربتر، ٹوٹے گھروندے اور کڑی تختے،
گوداموں کے ذخیرے، مال کے پھولے ہوئے بورے،
غریبوں کی جمع پونجی
کہ آڑے وقت کام آنے کو رکھی تھی۔
جو پل طوفان کے جھٹکوں نے توڑے ہیں، اکھاڑے ہیں
وہ تابوت اور لاشے، جن کے قبرستان اجاڑے ہیں
سڑک پر تیرتے پھرتے ہیں

خلقت کانپتی ہے
دیکھیے اب کس بلا کا سامنا ہوگا
خدا کا قہر نازل ہوگیا ، انجام کیا ہوگا ؟
غضب ہے ، موت کے منہ میں چلاجاتا ہے گائےبیل کا گلہ
جڑےگا اب کہاں سے اس قدر سامان اور غلہ
اس آفت کے برس جب کام سارے روس کے
ہاتھوں میں تھے مرحوم زار روس کے *
چھجے پہ وہ غم سے سراسیمہ نکل آئے
جو اپنی بےبسی دیکھی تو یہ دو بول فرمائے :
'' مشیت میں خدا کی بادشاہوں کو نہیں چارہ ،،
نظر کے سامنے تھا ایک بربادی کا نظارہ
وہ بیٹھے تک رہے تھے اور آنکھیں غم میں ڈوبی تھیں
کھلے میدان جھیلیں بن گئے تھے
اور اس دریاؤ میں سڑکیں کہیں ادھم میں ڈوبی تھیں
محل گویا جزیرہ تھا
کوئی آفت‌زدہ ٹیلا
ادھر سرکار نے جاری کیا فرمان
ادھر سے ان کے خاص الخاص جنرل دوڑکر آئے
بڑھے ایک اک سرے سے
دور کے، نزدیک کے ہر راستے سے
جہاں طوفان کی شورش تھی، پانی میں اترآئے
بچانے ان کو جو سیلاب کی دہشت کے مارے تھے
انھیں بھی جو گھروں میں ڈوبتے تھے، بےسہارے تھے

تبھی کا ذکر ہے، منظر یہ پیٹر چوک میں دیکھا
جہاں زینے پہ یوں پنجے اٹھائے اور زرا اچکے
کھڑے دو شیر پہرہ دے رہے ہیں جیسے سچ‌مچ کے
وہاں اک سنگ‌سرمر کے ببر کی پیٹھ پر چڑھ‌کر
بچارا ایوگینی یونہی ننگے سر

---

* الیکساندر اول جس کا انتقال ۱۸۲۵ ء میں ہوا ۔ (ایڈیٹر)

جما بیٹھا تھا دونوں ہاتھ باندھے اپنے سینے پر
دھاکے سے اڑا تھا رنگ چہرے کا
مگر اس کو نہ تھی اپنی کوئی پروا
نہ اتنا تن بدن کا ہوش باقی تھا
کہ طوفان بلانوش اور اونچا ہوگیا — یعنی
پہنچتا ہے سرے تلووں تلک پانی
نہ اس کی فکر تھی بوچھار میرے منھ پہ پڑتی ہے
ہوا یوں ہوکتی ہے جیسے غصے میں بگڑتی ہے
نہ اس کو ہوش تھا ٹوپی اڑاکر لے گیا جھونکا۔
اداسی چھاگئی تھی اس کی آنکھوں میں
مگر وہ ٹکٹکی باندھے کسی جانب کو تکتا تھا
اور اس جانب پہاڑوں کی طرح موجیں
ابلتی تھیں کہیں گہرائی سے، طوفان برپا تھا
مکانوں کے ہوئے جاتے تھے دس ٹکڑے
اچھلتے، ڈوبتے اس سمت سے آتے تھے بس ٹکڑے
خدایا خیر، یارب خیر، کیا اندھیر ہے یارب!
مٹا ڈالے گا سب کا سب!
وھیں سیلاب کے نزدیک، بالکل پاس کھاڑی کے
وھیں بدرنگ جنگلے کا
گھروندا تھا پرانا سا
وھیں پر سائے تھے پھیلے ہوئے ایوا کی جھاڑی کے
وھیں وہ دونوں رہتی تھیں پراشا اور بوڑھی ماں
پراشا خواب میرا، زندگی میری تھی، میری جاں
یہ کیا ہے؟ خواب ہے، خواب پریشاں دیکھتا ہوں؟ یا
ہماری زندگی خود خواب ہے اک — بےحقیقت سا،
زمیں پر آسمانوں کو ہنسی چھوٹی ہے؟ ہاھاھا!

وہ ایسے جیسے جادو سے گڑا ہو
سنگ مرمر میں جڑا ہو
بس وھیں بیٹھا رہا اور ٹس سے مس ہونے نہیں پایا۔
چڑھا دریا تو پھر پانی ہی پانی ہر طرف چھایا۔

مگر اس کی طرف سے پیٹھ موڑے ، منھ پھرائے
اور اٹل اونچائی سے بازو اٹھائے
یوں کھڑا تھا دیوتا — تانبے کے گھوڑے کی رکابوں میں قدم رکھے *
کہ نیوا کو جلال آیا ہے ، اس کی سرکشی پر اپنی شکتی کا بھرم رکھے

دوسرا حصہ

غرض بربادیاں پھیلا چکا تو چھک گیا دریا
کمینے پن کے ہنگاموں سے آخر تھک گیا دریا
چلا اب الٹے پاؤں سرکشی پر ، برھمی پر اپنی خوش ہوتا ،
اڑاتا ، پھینکتا، مال غنیمت راہ میں کھوتا
کہ جیسے گاؤں پر جب غول چڑھتا ہے لٹیروں کا
الٹ دیتے ہیں ظالم سنگ‌دل اس گاؤں کا تختہ
کہیں توڑیں‌گے ، کاٹیں‌گے ، اکھاڑیں‌گے ، پچھاڑیں‌گے
کسی کو پیس ڈالیں‌گے ، کسی کی جیب جھاڑیں‌گے
جھپٹ لیتے ہیں سب کچھ مارپیٹ اور دھینگا مشتی سے
دبا کر گالیوں سے ، دھمکیوں سے اور کشتی سے
ادھر گاؤں میں ہاہاکار مچتی ہے، ادھر ڈاکو
اٹھائے لوٹ کا مال اور تھکن سے چور ، بےقابو
کہیں پیچھا نہ ہو اس ڈر سے گھر کو بھاگ جاتے ہیں
جو مال اٹھتا نہیں ان سے ، اٹھاتے ہیں ، گراتے ہیں

زرا اترا جو پانی
کم ہوئی نیوا کی طغیانی
کھلی سڑکیں تو میرا ایوگینی تیز قدموں سے
امیدوبیم کے عالم میں دل تھامے ہوئے نکلا
چلا دریا کی جانب جو ابھی مشکل سے ٹھیرا تھا

---

* پیٹرسبورگ میں پیٹراول کی یادگار جس کو فالکونے نے بنایا تھا ۔ (ایڈیٹر)

ابھی سیلاب کی موجیں
فتح کے نشے میں سرشار تھیں
اور بدمزاجی میں ہوا سے برسر پیکار تھیں
ابھی تک جوش میں دریا تھا — اس کی تہہ میں انگارے
سلگتے تھے اور اوپر جھاگ کے چھٹتے تھے فوارے
ابھی تک سانس تھا نیوا کا بوجھل، دم بہت تھوڑا
کہ جیسے ہانپتا ہو جنگ سے بھاگا ہوا گھوڑا
وہاں پہنچا جو ایوگینی
تو کشتی گھاٹ پر پائی
وہ دوڑا جیسے کوئی گمشدہ دولت نظر آئی
صدا دی اس نے مانجھی کو
میاں اس پار پہنچا دو
تو لاپروائی سے مانجھی
دوانی پر ہوا راضی
بھیانک ہوں تو ہوں لہریں، کھلا لنگر، چلی کشتی

تجربےکار کشتی‌بان ان طوفانی لہروں سے
لڑا کچھ دیر تک جم کر، کبھی ڈوبے، کبھی اچھلے
جو تھے بیکل سوار اس پر
تو بیکل تھی سواری بھی
بچی مشکل سے جان آخر، کنارے جا لگی کشتی
وہ قسمت کا ستایا
اس سڑک پر، ان جگہوں پر دوڑکر آیا
جو اس کی جانی‌پہچانی تھیں۔
لیکن دیکھتا کیا ہے
کہ پہچانا نہیں جاتا کچھ ایسا حلیہ بگڑا ہے
پڑا تھا سامنے نظروں کے سب کا سب تہہ‌وبالا
ادھر ٹوٹا، ادھر لوٹا، کہیں پھینکا، کہیں ڈالا
نہ تھا سامان رکھنے کو، نہ کوئی اس کا رکھوالا۔
جو باقی تھے کمر ٹوٹی ہوئی تھی ان مکانوں کی
کہیں ملبے کے نیچے قبر تھی پچھلے ٹھکانوں کی

سرک آئے تھے کچھ بنیاد سے پانی کے ریلے میں
وہ ستھراؤ تھا جیسے جنگ کے میدان میں لاشیں۔
مگر وہ اپنی دھن میں منھ اٹھائے چل دیا سیدھا
نہ کھلتی تھی زباں غم سے، نہ اس کی یاد میں کچھ تھا
ادھر دوڑا ہوا جاتا تھا ایوگینی
جہاں پر ایک انجانی مصیبت راہ تکتی تھی
لفافہ بند اوپر مہر تھی گویا
مگر تقدیر کی لکھی تھی، ٹالے ٹل نہ سکتی تھی
کنارے شہر کے، پوروے میں جب لپکا ہوا پہنچا
تو کھاڑی مل گئی — لیکن جو اس کے پاس ہی گھر تھا؟
کہاں ہے وہ؟ یہیں پر تھا...
ٹھٹک کر رہ گیا، پیچھے ہٹا، پھر اور بھی پیچھے
یہاں دیکھا، وہاں دیکھا، کہیں ہو تو دکھائی دے
یہی تو وہ جگہ ہے، گھر یہیں تھا، کیا ہوا آخر؟
یہ ہے ایوا کی جھاڑی — گھر کہاں ہے پھر؟
یہاں پھاٹک تھا — شاید بہہ گیا ہوگا!
مگر وہ گھر کہاں ہے؟ کچھ نشاں تو رہ گیا ہوگا!
پھرا چاروں طرف لیکن نشاں باقی نہ سایہ تھا
وہ چکر کاٹتا تھا اور کلیجہ منھ کو آیا تھا
کبھی خود سے الجھتا، دل کو سمجھاتا تھا بےچارہ
پھر اکدم ہاتھ ماتھے پر پٹک کر قہقہہ مارا۔

کٹا وہ دن بھیانک رات آئی
اور تاریکی لرزتے شہر پر چھائی
مگر پچھلے پہر تک آنکھ ہی لگنے نہیں پائی
ڈرے تھے لوگ کچھ ایسے کہ اوروں کو ڈراتے تھے
جو دن بیتا تھا اس کے رات بھر قصے سناتے تھے۔

کرن جب صبح کی نکلی
تھکے، بےجان، پھیکے بادلوں کی آڑ سے ہوکر
کئے تابندہ پائے تخت کے سنسان بام و در

مگر بیتے ہوئے دن کی مصیبت کا
کہیں نام و نشاں باقی نہیں پایا
شفق نے اپنی عنابی سی اک چادر بنا ڈالی
اجالا صبح کا پھیلا تو بدرنگی مٹا ڈالی
چلی تو زندگی پھر چل پڑی پہلے کے ڈھرے پر
کھلی سڑکوں پہ نکلے لوگ اپنی بےحسی لے کر
سدھارے اپنا اپنا شب بسیرا چھوڑ کر بابو،
بجانے نوکری لپکے ہوئے جاتے تھے بےقابو
ادھر وارے نیارے کرنےوالا تیز بیوپاری
اٹھا دوکان پھر سے کھولنے، ہمت نہیں ہاری
جو تہہخانوں میں تھا
نیوا کے دست ظلم سے باقی کھرا کھوٹا
اسی کو پھر جمایا :
لاؤ میں ہمسائے سے پورا کروں ٹوٹا
مکانوں سے بڑھے کچھ لوگ اپنی کشتیاں لے کر -
نواب اگلے زمانوں کا
خووستوف ایک شاعر تھا چہیتا آسمانوں کا
قلم برداشتہ وہ لکھ گیا اشعار لافانی
کہ کیسے شہر ڈوبا اور ہوئی نیوا میں طغیانی

مگر افسوس،
وہ میرا بچارہ، غم کا مارا ایوگینی تھا
کہ اس کی عقل ہی جاتی رہی، ایسا پڑا صدمہ
ہواؤں کے تھپیڑے اور اس طوفان کے دھارے
بجاتے تھے ابھی کانوں میں نقارے
ابھی تک کان پھٹتے تھے
اسی اک شور کے مارے
لبوں پر سہر تھی، پاؤں میں چکر، سر میں تھا سودا
وہ جیسے خواب کے عالم میں بےآرام پھرتا تھا
کٹے یوں سات دن، گزرا سہینہ بھر
نہ بھولے سے کبھی لوٹا وہ اپنے گھر

ہوئی میعاد تو مالک نے سوچا ، گھر ہوا خالی
کرائے پر کسی قلاش شاعر کے
حوالے کردیا اور سونپ دی تالی
نہ آیا ایوگینی پھر کبھی سامان لینے کو ۔
وہ دنیا کی نظر میں اجنبی ٹھیرا تو — آمادہ
نہ تھے پہچان‌والے بھی اسے پہچان لینے کو ۔
وہ سارے دن یونہی پیدل بھٹکتا تھا
کبھی گھاٹوں پہ سوجانا
کہیں کھڑکی سے ٹکڑے مانگنا ، کھانا
بدن پر چیتھڑے اور چیتھڑوں میں ایک دیوانہ
شرارت ہر جگہ بدذات بچے کر گزرتے تھے
اسے پیچھے سے پتھر مارتے تھے ، شور کرتے تھے
ہٹاتے راہ سے چابک اڑاکر کوچوان اس کو
کہ چلنے میں کبھی رہتا نہ تھا سڑکوں کا دھیان اس کو
یہ لگتا تھا کہ سب اس کی بلا سے
جو گزرنی ہے گزر جائے
وہ اندر شور محشر تھا کہ باہر کی
نہ — کانوں تک خبر جائے
گھسیٹے جا رہا تھا جیسے تیسے زندگی کے دن
نہ بن باسی ، نہ انسانوں کی بستی کا کوئی ساکن
نہ زندہ تھا ، نہ مردہ ، بھوت لگتا تھا ، نہ کوئی جن ۔

یہ جاتی گرمیوں کا ذکر ہے ، بارش کا موسم تھا
کہ اک دن سوتے سوتے گھاٹ پر نیوا کے وہ اٹھا
برے آثار تھے :
دیوار سی موجوں کی اٹھ اٹھ کر
کبھی گھاٹوں میں چڑھ جاتی
کبھی جھاگوں میں بڑھ جاتی
کبھی پٹری کی چکنی سیڑھیوں سے مارتی ٹکر
کوئی انصاف جیسے مانگتا ہو اور پٹکے سر
عدالت ایسی غافل ، جوں نہ رینگے اس کے کانوں پر

اٹھا وہ غم کا مارا نیند سے
دیکھا ، فضا مرجھائی تھی ساری
زمیں پر ابر کے آنسو ، ہوا میں گریہ وزاری
اندھیری رات تھی اور دور کوئی سنتری گویا
ہوا کی دکھ بھری آواز پر آواز دیتا تھا ...
اٹھا جب ایوگینی چونک کر تصویر سی ابھری
جو بیتی تھی مصیبت ، یاد میں پھر سے وہی ابھری
وہ گھبراہٹ میں قدموں پر سنبھلنے بھی نہیں پایا
چلا بس منھ اٹھائے بےخبر ہوکے
کہیں پر ایک دم ٹھٹکا ، قدم روکے
بہت آہستہ سے نظریں گھمائیں،
ہر طرف دیکھا
برستی تھی مگر چہرے پہ وحشت ، خوف طاری تھا
انھی کھمبوں کے آگے اس حویلی پر کھڑا تھا وہ
جہاں زینے پہ یوں پنجے اٹھائے اور زرا اچکے
کھڑے دو شیر پہرہ دے رہے تھے جیسے سچ مچ کے
اندھیرا اور اوپر سامنے ابھرا ہوا پتھر
چٹان اتنی بڑی، چاروں طرف جنگلے کی اک جھالر
بلندی سے اٹھائے ایک بازو — شان سے ڈٹ کر
جمائے اپنا آسن دیوتا تانبے کے گھوڑے پر

یکایک ایوگینی کے بدن میں جھرجھری آئی
خیالوں کی بھیانک رو بری آئی
اسے یاد آ گیا — ہاں ہاں !
یہی تھی وہ جگہ ابلا جہاں طوفاں
جہاں خونخوار موجیں طیش میں آکر
چڑھی آتی تھیں سینے پر
یہی وہ شیر ہیں ، وہ چوک ہے
اور یہ وہ ہستی ہے
جو ٹس سے مس نہیں ہوتی ،
جو اونچائی پہ بستی ہے

اندھیرے میں اٹھائے سیس تانبے کا
یہی ہے جس کے اندھے حکم نے دیکھا نہ بھالا
زعم میں آکر
سمندر کے کنارے شہر چن ڈالا
یہ ہیبت ناک چہرہ اور اوپر سے اندھیرے کا بڑا ہالا!
زرا تبور تو دیکھو، جی میں اس کے کیا سمائی ہے!
بھرا ہے کس بلا کا زور، کیا زور آزمائی ہے!
اور اس گھوڑے میں شاید آگ ہے کوئی
بتا مغرور گھوڑے
ہاں کدھر جاتا ہے تو ٹاپیں اٹھائے
اب کہاں ٹیکے گا سم اپنے؟
بڑا شہزور ہے تو بول،
تقدیروں کے مالک، کیا خیالوں میں ہے گم اپنے
بتا ہاں، تو نے پہلے بھی یہی بل آزمایا تھا؟
اڑا کر یوں ہی لوہے کا دھانہ روس کو بھی کیا
الف کر کے اتھاہ گہرائیوں پر جا چڑھایا تھا؟

کئی چکر کئے بیچارے پاگل نے سنگھاسن کے
بہت وحشت بھری اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی
تنا بیٹھا تھا اب بھی دیوتا
آدھے جہاں کا وارث ووالی
دھواں سا بھر گیا سینے میں
ٹھنڈے سیخچوں پر رکھ دیا ماتھا
پڑا آنکھوں پر اس کی دھند کا پردہ
پرانے زخم سارے چھل گئے، لودے اٹھے دل میں
لہو میں کوئی چنگاری پڑی، شعلے اٹھے دل میں
غم وغصے میں یوں مغرور بت کے سامنے اس نے
مروڑی انگلیاں اور دانت پیسے اس طرح، گویا
کوئی آسیب ہو سر پر، کہا یہ ہونٹ بھینچے
"اوہ، بڑا آیا عمارتساز!
دکھلاتا پھرا اعجاز!

اب تو ٹھیر جا — تجھ کو دکھاتا ہوں ! .. ،،
اتنا کہا اور کانپتا بھاگا
نہ دیکھا دائیں بائیں، منھ اٹھائے، ہانپتا بھاگا
لگا یوں اک نظر میں ایوگینی کو
کہ جیسے زار کے چہرے میں جنبش ہو
وہ لمحے بھر میں غصے کی دمک آئی
کہ آہستہ سے بدلا اور بڑی ویسی چمک آئی
وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا
اور سناٹے میں جب اس چوک سے گزرا
تو آوازیں سنائی دیں اسے ، کرتی ہوئی پیچھا
فٹافٹ ہو رہی ہو، جھنجھناہٹ ہو
زمیں پر زلزلے کی سنسناہٹ ہو
کھڑنجے پر بجیں ٹاپیں ، سڑک پر دندناہٹ ہو
ہوا میں ہاتھ اٹھائے
اور پھیکی چاندنی میں جگمگائے
شہسوار آتا ہو تانبے کا
جھپٹ کر کر رہا ہو اس طرح پیچھا
کہ پتھر پر بجے سم اور چنگاری اڑائے
وہ دیوانہ بچارہ ، رات بھر دوڑا پھرا —
لیکن جدھر کا رخ کیا ، معلوم ہوتا تھا
کہ سر پر آگئی اس کی سواری
سم پٹکتی اور قدم رکھتی ہوئی بھاری -

وہ دن اور آج کا دن —
جب کبھی اس چوک سے گزرا
پریشانی سے حالت غیر ، چہرہ فق
بڑی جلدی میں دل تھامے ہوئے گزرا
تڑپنے میں ہو گویا اک یہی تسکین کی صورت
اتارے ملگجی ٹوپی، نظر نیچی کئے گزرا
وہ یوں سہما گزر جاتا تھا پہلو سے کہ پھر اس نے
نہ سر اونچا کیا ، دیکھی نہ پھر تانبے کی وہ مورت -

سمندر میں نظر آتا ہے — اک ویران چھوٹا سا جزیرہ
اور کبھی جب دیر ہوجائے تو اپنی کھیپ لے کر
اس جزیرے پر مچھیرا جا نکلتا ہے
وہاں ہنڈیا چڑھا دیتا ہے اپنا پیٹ بھرنے
اور کبھی اتوار کو تفریح کرنے
دور سے بجرا بڑھاتا کوئی بابو، آنکلتا ہے
زمیں ہے اس قدر بنجر
نہ بستی ہے، نہ کوئی گھاس کا پتہ نکلتا ہے
وہیں سیلاب سے بہتا بہاتا اک پرانا گھر
کنارے آ لگا، جیسے ہو کالا جھاڑ پانی پر
زرا سردی ڈھلی اور برف گلنے کے جو دن آئے
اسے پلوار پر لادا، جزیرے سے اٹھا لائے
گھروندا کیا تھا اک برباد غم خانہ
پڑا تھا اس کی چوکھٹ پر مرا بےچارہ دیوانہ
وہ ٹھنڈی لاش تھی، اجلا کفن پہنا دیا اس کو
خدا کے نام پر دفنا دیا اس کو ۔

۱۸۳۳ء

قصّے

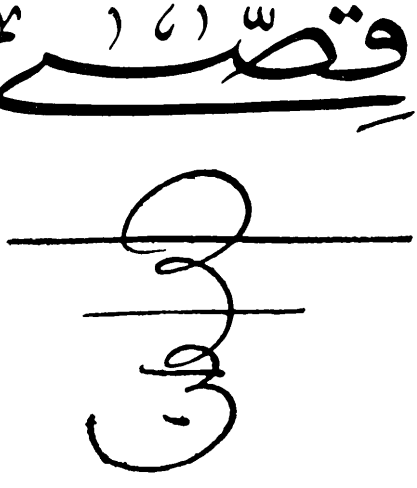

پادری اور اس کا خدمتگار

سنا ہے کہ رہتا تھا اک پادری
مگر اس کے بھیجے میں بھوسی بھری
وہ اک روز جاتا تھا بازار سے
کہ سستا سا سودا سلف دیکھ لے
وہیں سامنے سے بھٹکتا ہوا
زرا دائیں بائیں اٹکتا ہوا
وہ بدھو بھی پہنچا
جسے روسی بھاشا میں ''بلدا،، کہیں
''کہو پادری جی، کدھر کو چلے
سویرے سویرے
کہاں کے ارادے ہیں، کیا چاہئے؟،،
''میاں کیا بتاوں، مجھے چاہیے ایسا اک آدمی
جو باورچی ہو اور سائیس ہو
بڑھئی کے ہنر میں بھی اکیس ہو
بھلا ایسا نوکر کہاں پائیے
کہ ہو کام دھندے میں بھی ہوشیار
نہ ہو اتنا مہنگا کہ بن جائے بار،،
میاں بدھو بولے کہ ''اچھا جناب
میں بلدا ہوں کیجئے مرا انتخاب
کروں گا میں سب کام جی جان سے
نبھا جاؤں گا دھرم ایمان سے
مرا کیا ہے، ابلے ہوئے آلو کھا کھا کے کاٹوں گا دن
نہ بیٹھوں گا ٹھالی کبھی کام بن
مجوری مری، کچھ نہیں
سال میں تین ٹھونگے
اسی پاک ماتھے پہ ہوں گے
سکھی ہوں میں اتنے ہی انعام سے

جو سرکار خوش ہوں مرے کام سے ،،
سنا، سوچ میں پڑ گیا پادری
کہ یہ تین ٹھونگے کی اچھی کہی
میاں ٹھونگے ٹھونگے میں انتر بڑا
کوئی نرم ٹھونگا تو کوئی کڑا
چلو، دیکھی جائےگی یہ بھی سہی
کہا اس نے بدھو سے ’’ اچھا ، رہی
وہی لو مجوری جو تم نے کہی
حویلی میں میری ترے واسطے
ٹھکانا بہت سر چھپانے کا ہے
ترا کام محنت دکھانے کا ہے
غرض اس طرح ان کا سودا پٹا
حویلی میں بدھو
کسی کونے کھدرے میں رہنے لگا
جو سوئے تو ہو پیال پر اس کا بستر
جو کھائے
تو چار آدمی کے برابر
جو کرنے پہ آئے
تو سات آدمی کا کرے کام ڈٹ کر
سویرے سے نمٹائے سب کام کاج
زمیں کی جوتائی
تو گھوڑے کا ساج
دوکانوں پہ دوڑے
تڑک میں ہی تیار چولھا کرے
ہوں انڈے بھی صاف اور ابلے دھرے
بہت خوش تھی بدھو سے خود پادرن
مگر اس کی بیٹی کو رہتی کڑھن
کہ اک جان اور اس پہ اتنے جتن
اسی گھر میں بچہ بھی تھا گود کا
وہ بدھو میاں سے بہت ہل گیا
چٹائے اسے کھیر بدھو تو وہ

پکارے ''چچا آؤ گودی میں لو،،
سبھی کو یہ نوکر تھا پیارا، مگر
کھٹکتی تھی کچھ پادری کی نظر
پسیجا نہیں وہ کبھی بھول کر
اسے فکر تھی، آرہا ہے سمے
حساب اس کا کرنا ہے، کیسے جمے!
نہ پینے کی لذت نہ کھانے کا چین
جلے رات بھر آنکھ کی لالٹین
یہ حالت ہوئی روز کی فکر سے
کہ ہر وقت ماتھا ٹھنکتا رہے
غرض پادرن سے کہا ''بھاگوان
بتا کچھ کہ الجھن میں ہے میری جان
جو گتھی پڑے اور مشکل ہو چال
تو کرتی ہے عورت کی بدھی کمال
وہ ترکیب میں، چال میں تیز ہے
ہر اک جی کے جنجال میں تیز ہے
کہا اس نے ''تدبیر سن مردوے
اسے کام ایسا کوئی سونپ دے
کہ ہو بس سے باہر
جتا دے کہ دیکھ، اس کو کرنا ہے سو فیصدی
یہ ترکیب سوچی ہے اس زور کی
کہ لاٹھی نہ ٹوٹے، مرے سانپ بھی
نہ بلدے کو دینا دلانا پڑے
نہ ٹھونگا ہی ماتھے پہ کھانا پڑے،،
سنا یہ تو بس پادری کھل گیا
اسے نسخۂ کیمیا مل گیا
ڈپٹ کر کہا ''سن بے، تکتا ہے کیا
بلاتا ہوں تجھ کو ادھر آ زرا
جو کہتا ہوں، سن غور سے، کھول کان
بقایا ہے بھوتوں پہ میرا لگان
یہ ہے ان کے ذمے مرے جیتے جی

برس تین سے ایک کوڑی نہ دی
نمٹ دال دلیے سے، ساگر کو جا
بقایا کی اک ایک پائی اوگھا
یہ اک کام دیتا ہوں ، کرکے دکھا ،،
نتیجہ نہ دیکھا جو تکرار سے
تو ساگر کو بدھو میاں چل دیے
(یہ سوچا کہ اچھا ، دکھاتا ہوں میں
انھیں انگلیوں پر نچاتا ہوں میں)
کنارے سے ڈالی سمندر میں رسی گھمائی پھرائی بڑی دیر تک
مچی کھلبلی اور سرا تہہ میں پہنچا تو اٹھی دھائی بڑی دیر تک
پرانا سا اک بھوت باہر نکل
پکارا کہ ،، کیا ہے بے او بدھو مل ؟
یہاں کیوں مچاتا ہے تو گڑبڑی
ہمارا سمندر، تجھے کیا پڑی؟،،
کہا ،، یوں نہیں باز آنے کے تم
سمندر میں رسی گھمالوں تو پھر
مروڑوں زرا تم کمینوں کی دم ،،
یہ سنتے ہی وہ بھوت گھبرا گیا
کہ یہ کیسے بےڈھب سے پالا پڑا!
پکارا ،، خفا کیوں ہو، کس بات پر؟،،
بگڑکر یہ بولا ،، نہیں کیا خبر ؟
کہ کب سے بقایا ہے تم پر لگان
نہ بھرتے ہو پیسہ نہ دھرتے ہو کان
بہت سر اٹھایا ہے، اب پھل چکھو
زرا دیکھوں تو کتنے پانی میں ہو !،،
وہ بولا
،، بگڑتے ہو کیوں پیارے بدھو میاں
ذرا ٹھہر جاؤ
نہ گڑبڑ مچاؤ یہاں
ابھی بھیجے دیتا ہوں سارا لگان
تمھیں دے گا پوتا ہمارا ، لگان ،،

کہا جی میں بدھو نے اب دیکھیے
نمٹنا پڑے چھوٹے شیطان سے
کہ اتنے میں بھوکا بلوٹا بنا
بھڑق سے نکل آیا اک بھوتنا
خوشامد سے بدھو کو کرکے سلام
کیا خنخنے ٹیٹووں سے کلام
'' یہ کیسی وصولی پہ آئے ہو تم
بڑی بےاصولی پہ آئے ہو تم
میاں، ہم تو ہیں بھوت، ہم کو بھلا
لگانوں وگانوں سے کیا واسطہ ؟
سنا تک نہیں ہم نے پہلے کبھی
مگر تم جو کہتے ہو، یوں ہی سہی
یہ رکھا ہے تھیلا رقم اس میں ہے
مگر پہلے دیکھیں کہ دم کس میں ہے
جو پہلے سمندر کا چکر لگائے
وہ جیتے، یہ تھیلا اٹھا، گھر کو جائے ''
سنا ، ہنس پڑا سن کے بدھو میاں
'' ابےجا ، کہاں میں کہاں تو میاں!
بھلا سامنے میرے آئےگا تو
سمجھ لے، بڑی منھ کی کھائےگا تو ۔
اگر حوصلہ ہے تو مجھ سے نہیں
زرا چھوٹے بھیا سے ہوجائے دوڑ ''
وہیں پاس جنگل تھا
اس میں کہیں سے دو خرگوش پکڑے
بڑے موٹے تگڑے
انھیں ایک تھیلے میں ڈالا
سمندر پہ پہنچا
پکڑ کان خرگوش باہر نکالا
یہ بولا '' دیکھا بھوتنے اپنی چال
ابھی تو ہے بالشت بھرکا جنا
ہے جھوجھا چنا اور باجے گھنا ۔

میں کیوں اپنی اوقات کھوؤں گا ، چھوڑ
یہ لے، میرا بھیا رہا تیری جوڑ
زرا ناپ لے ساتھ اس کے زمیں
لگا دوڑ، ہاں، ایک دو — اور تین ،،
وہ جوڑی جو چھوٹی تو پر لگ گئے
کنارے کنارے وہ بھتنا چلا
مگر یہ تو تم جانو خرگوش تھا
جو چھوٹا تو سدھ بھی نہ دنگل کی لی
وہ جنگلی تھا ، بس راہ جنگل کی لی
ادھر سے وہ بھتنا
سمندر کا تٹ ناپتا
بہت دور سے ہانپتا کانپتا
جو پہنچا پسینے میں ڈوبا ہوا
تو سوچا کہ بازی رہی میرے ہات
میں بدھو سے منواؤں گا اپنی بات
(ابھی اس کے تھیلے میں خرگوش تھا
نہ کچھ اس سے چھوٹا، نہ اس سے بڑا)
قریب آیا بھتنا تو چھوٹے میاں
مزے میں جھپکتے تھے لال انکھڑیاں
تھپکتا تھا بدھو بڑے پیار سے
،، بہت دوڑے بھیا ، بہت تھک گئے
اب آرام کرلو، مرے لاڈ لے ،،
یہ نقشہ جو دیکھا بڑا اٹ پٹا
تو بالکل ہی بھتنا گیا سٹپٹا
سمیٹے بدن دم دبائے ہوئے
تکے اس کو، آنکھیں چرائے ہوے
پھر آخر کہا ،، میں نے لی ہار مان
ابھی تجھ کو دیتا ہوں سارا لگان ،،
وہ دوڑا گیا
پکارا کہ دادا دھائی تری
ہرایا مجھے چھوٹے بدھو نے ایسا کہ سب آبرو ہوگئی کرکری

یہ بھتنوں کا دادا بڑا گھاگھ تھا
خبر سن کے کچھ سوچ میں پڑ گیا
ادھر پھر سے بدھو نے طوفاں اٹھایا بہت
سمندر میں رسا گھمایا بہت
اٹھیں ایسی لہریں
کہ چھوٹے بڑے بھوت تنگ آ گئے
وہ بھتنا نکل کر پکارا — ''امان !
ابھی تجھ کو بھرتے ہیں سارا لگان
مگر سن ، ابھی شرط باقی ہے ایک ،
یہ لاٹھی جو لایا ہوں اس کو اٹھا
بہت دور کوئی نشانہ بنا
نشانے سے بھی آگے جو پھینک دے
وہ جیتا ، رقم لے کے چلتا بنے
کہو بدھو، اب تم کو کاہے کی سوچ؟
یہ ڈر ہے کہ آئے گی پہنچے میں موچ!،،
'' نہیں بے، مجھے ڈر ہے اس بات کا
کہ پھینکی اگر میں نے لاٹھی گھما
وہ بادل ہیں، ان سے پرے جائے گی
تو روتا پھرے گا ، نہ مل پائے گی۔
مجھے کیا ، میں رسا گھماؤں گا پھر
مزا بھوتنوں کو چکھاؤں گا پھر،،
سنا یہ تو بھتنا پڑا سوچ میں
مگر فائدہ کیا تھا سنکوچ میں
وہ دوڑا گیا اپنے دادا کے پاس
بہت دل شکستہ ، بہت بدحواس
ادھر پھر سے بدھو نے رسا لیا
وہ طوفاں اٹھایا
کہ بھوتوں کا پھر ناک میں دم کیا
نکل کر یہ بھتنا پکارا کہ '' ٹھیر
بس اک آخری شرط ہو جائے خیر،،
'' نہیں بے، بہت ہو چکی شرط ورط ،،

چلے گی نہ آگے تری کوئی شرط
ہے اب میری باری، بتاؤں گا میں
مزا راکھشس کو چکھاؤں گا میں
یہ بھورا بچھیرا کھڑا ہے — ادھر
اٹھالے اسے لے کے چل کوس بھر
اگر تو اٹھالے تو تیرا لگان
نہیں تو، میں جیتا، پکڑ اپنے کان ،،
جو کی اس سے بدھو نے دو ٹوک بات
تو بھتنے نے سوچا کہ کھاؤں نہ مات
وہ جھٹ سے بچھیرے تلے گھس گیا
بہت زور مارا، ہیئی شا، ہیئی شا
اٹھا کر بچھیرے کو دو ڈگ بھرے
جو گھٹنے پچک جائیں، وہ کیا کرے
غرض تیسرے ڈگ میں بولا وہ چیں
نہ اٹھ پایا، ٹانگیں پساریں وہیں
ڈپٹنے لگا اس کو بدھو میاں
،، ابے جا، کہاں میں، کہاں تو، میاں
تو مورکھ تھا جو مجھ سے بازی بدی
الجھنے کی اتنی ضرورت نہ تھی
بچھیرا جو اٹھا نہ تجھ سے، بھلا
مجھے دیکھ ٹانگوں میں بھر کر چلا ،،
سوار اس پہ بدھو ہوا جس گھڑی
بچھیرے نے ایسی بھری چوکڑی
اڑی دھول — اک دم ہوا ہو گیا
ڈرا بھوتنا — ہیں، یہ کیا ہو گیا ؟
وہ دوڑا گیا اپنے دادا کے پاس
بہت دل شکستہ، بہت بدحواس
نہ ترکیب باقی رہی اور نہ چال
تو سوچا کہ عزت کا صدقہ ہے مال
سمیٹا لگان اور تھیلے میں ڈال
تھمایا اسے : ،، لے رے بدھو سنبھال ،،

لیے مال ، کرتے چلے ہائے وائے
تو بدھو میاں خیر سے گھر کو آئے
جو دیکھا کہ پھر یہ بلا آ گئی
بدکنے پچکنے لگا پادری
اسے ڈر کے مارے چڑھی کپکپی
چھپا جا کے جورو کے پیچھے مگر
وہاں بھی بدن میں سمایا تھا ڈر
جو ڈھونڈھا تو بدھو نے پایا اسے
رقم بھر کے تھیلا تھمایا اسے
کہا : ”پادری جی لگان اپنالو
میں جاتا ہوں ، اب میرا چکتا کرو“
بچارے کو ماتھا بڑھانا پڑا
بڑے زور کا ٹھونگا کھانا پڑا
لگا پہلا ٹھونگا
تو چھت تک اچھل کر گیا پادری
پڑا دوسرا تو
زباں اس کی تالو سے باہر گری
لگا تیسرا ٹھونگا ایسا شدید
کہ صاحب کے سر سے نکل آئی لید
وہ بدھو چلا طعنے دیتا ہوا
”جو سستے کے پیچھے نہ جاتے میاں
تو ماتھے پہ ٹھونگا نہ کھاتے میاں۔“

۱۸۳۰ء

مچھلی اور مچھوے کی کہانی

نیلے ساگر کے بالکل ہی
پاس پرانی سی کٹیا تھی
اس کٹیا میں بوڑھا بوڑھیا دونوں ساتھ رہا کرتے تھے
پورے تیس اور تین برس سے رہتے اور سزا کرتے تھے
بوڑھا جال اٹھاکر جائے
مچھلی پکڑے، گھر کو لائے
بوڑھیا بیٹھی چرخہ کاتے
چرخہ، چرخ چوں چوں گائے
ایک دفعہ بوڑھے مچھوے نے
پانی میں سے جال سمیٹا
لے دے کے بس نکلی کائی
پھر سے جال بچھا کر کھینچا
اک پن جھاڑی لپٹی آئی
تسرا کے بوڑھے نے اپنا
جال سمندر میں پھیلایا
اب جو جال سمیٹا اس میں دیکھا نکلی کیسی مچھلی!
سچ پوچھو تو سونے کی تھی — کوئی ایسی ویسی مچھلی!
مچھلی منت کرکے بولی
آدمی کی سی بولی ٹھولی
کہنے لگی — ''اے، بوڑھے بابا!
جال کا پھندا کردو ڈھیلا
نیلا ساگر ہے گھر میرا
مجھ کو اپنے گھر جانے دو اپنا مول چکا دوں‌گی میں
میرا کہنے مانوگے تو منھ مانگا بدلہ دوں‌گی میں،،
بوڑھا چونکا، بچکا، سہما
پورے تیس اور تین برس تک
جال اٹھاتے، جال بچھاتے (گھس گئی، اس کے ہاتھ کی ریکھا)
بولنا مچھلی کا سننے میں آیا اور نہ آنکھوں دیکھا

ڈھیلا کرکے جال کا پھندا
پیار سے بولا بوڑھا مچھوا
'' اچھا، بھئی، سونے کی مچھلی، جا ، تو ، بھی کیا یاد کرےگی
مجھ کو نہیں کچھ لینا دینا، مجھ پر کیا ھن برسادے گی!
جل تھل تیرا سارا آنگن
سیر سپاٹے کر ، بھلا من ،،

لوٹ کے بوڑھا گھر کو آیا
کہہ‌دی جو دیکھی تھی مایا
بولا '' سنتی ھو جی، بڑی بی ؟
آج اک مچھلی جال میں آئی
کیا بتلاؤں کیسی تھی وہ ؟
کیا کچھ ایسی ویسی تھی وہ ؟
سونے کی مچھلی اور بولے
سچ‌مچ جیسے ھم تم بولیں
کہنے لگی : ' اے بوڑھے بابا،
جال کا پھندا کردو ڈھیلا
نیلا ساگر ھے گھر میرا
مجھ کو اپنے گھر جانےدو اپنا مول چکا دوں‌گی میں
میرا کہنا مانوگے تو، منھ مانگا بدلہ دوں‌گی میں،
میری بھلا کیا ھمت تھی جو
اس سے دام چکاتا، بولو ؟
یوں ھی چھوڑ دیا میں نے تو ،،
یہ سنتے ھی گرجی بوڑھیا ، بوڑھے کو پھٹکارا کس کر
'' ھت تیرے کی ، جنم کے بدھو، عقل پہ تیری پڑ گئے پتھر
تجھ کو مانگنا بھی نہ آیا
موقع پایا اور گنوایا
منھ پھوٹے سے اتنا کہتا '' دلوا دو اچھا سا تسلا
اور ھمارا تو بالکل ھی ھوگیا چھلنی سارا تسلا ،،

بوڑھا الٹے پاؤں سدھارا
نیلے ساگر پر جا پہنچا

دیکھا کیا نیلے ساگر میں
اٹھیں ہلکی ہلکی لہریں
بوڑھے نے اک ہانک لگائی ، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
'' کیوں بابا ، کیا چاہیے تم کو ؟،،
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
'' رحم کرو تم مچھلی رانی
بوڑھیا میری ہے دیوانی
اس نے ایسے فیل مچائے
جن سے ناک میں دم آجائے
کہتی کیا ہے، جاؤ، مانگ کے لاؤ ایک نیا سا تسلا
اور ہمارا تو بالکل ہی چھلنی ہوگیا سارا تسلا ،،
مچھلی بولی '' اچھا بابا
جو مانگا ہے مل جائے گا
غم نہ کرو ، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ ،،

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
ایک نیا تسلا دیکھا ، جو
بوڑھیا کے آگے رکھا تھا
دیکھتے ہی وہ کھوسٹ بوڑھیا، اور ہوئی آپے سے باہر
'' ہت تیرے کی ، جنم کے بدھو ، عقل پہ تیری پڑگئے پتھر
تجھ کو مانگنا بھی نہ آیا
بس اک تسلا مانگ کے لایا
تسلا دو کوڑی کی مایا
الٹے پاؤں چلاجا بدھو اور مچھلی سے جھک کر کہیو
تسلا تو دلوایا تم نے، ایک اچھا سا گھر دلوا دو ،،
بوڑھا مچھوا اٹھ کر سیدھا

پھر نیلے ساگر پر پہنچا
دیکھا تو نیلے ساگر میں
اب کے اٹھیں زور کی موجیں
بوڑھے نے اک ھانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ بولی :
'' کیوں بابا ، کیا چاھیے تم کو؟،،
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
'' رحم کرو سرکار مری تم ، جورو نے جنجال میں ڈالا
اب تو میری بوڑھیا اور بھی ھوگئی آفت کا پرکالہ
تریا ھٹ سے جینا دوبھر
مانگ رھی ھے ایک نیا گھر،،
مچھلی بولی '' اچھا بابا
جو مانگا ھے مل جائےگا
یوں ھی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ،،

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
دائیں بائیں کٹیا ڈھونڈھی
پھر بھی اس کا کھوج نہ پایا
آگے دیکھا ایک ایسا گھر
جس میں روشندان تھا اوپر
پکی اینٹوں کا چوبارہ
اوپر سے چونے کا پچارہ
شیشم کی لکڑی کے پھاٹک
پالش اوپر سے نیچے تک
جگمگ ، جگمگ ، جگمگ ، جگمگ
کھڑکی اوپر جھلمل بتی
نیچے گھروالی کا مکھڑا

(بوڑھا من میں سوچے ، لو بھئی
اب تو نمٹا ، گھر کا دکھڑا)
لیکن بوڑھے کو دیکھا تو
اور چڑھا بوڑھیا کا پارہ
خواب اسے ڈانٹا پھٹکارا
'' ہت تیرے کی ، جنم کے بدھو ، عقل پہ تیری پڑگئے پتھر
سورکھ تونے مچھلی سے جو مانگا بھی تو مانگا اک گھر
جا ، اب الٹے پاؤں چلاجا اور مچھلی سے جاکر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا ، یہ دوکوڑی کی نیچ دہاتن رہنا
میں تو بنوں‌گی اونچے گھر کی ، جس کا محل میں رہنا سہنا ''

بوڑھا کان دبائے نکلا
سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھا ساگر ہے کچھ بیکل
ہوتی ہے لہروں میں ہلچل
بوڑھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
'' کیوں بابا ، کیا چاہیے تم کو ؟ ''
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
'' رحم کرو سرکاری مری تم
بوڑھیا کی تو عقل ہوئی گم
مجھ بوڑھے کو اس جھنجھٹ سے
ناک میں دم ہے تریا ہٹ سے
بننے چلی ہے اونچے گھر کی، جس کا محل میں رہنا سہنا
اس کو نہیں بھاتا اب دو کوڑی کی نیچ دہاتن رہنا ''
مچھلی بولی '' اچھا بابا
یہ بھی سہی ، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ ''

بوڑھا مچھوا گھر کو آیا
دیکھا تو پلٹی تھی کایا
دیکھتا کیا ہے :
یہ اونچا سا محل کھڑا ہے
آگے کو زینہ نکلا ہے
اور زینے پر اس کی بڑی ہی
ہیں موجود بڑے ٹھسے سے
بڑھیا بڑھیا زیور پہنے
سر پر جوڑا ایسا موٹا
اور جوڑے میں سچا گوٹا
تن پر نرم روئیں کا دگلا
استر جیسے بھورا بگلا
گردن میں مالا مٹی سی
اور مالا میں سچے موتی
ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھی
جوتی جیسے بیر بہوٹی
آگے پیچھے نوکر چاکر
جلدی جلدی دوڑ رہے ہیں
سب اس کی خاطر میں لگے ہیں
اور بڑی بی ناک چڑھائے
گالی دے، کوسے ، دھمکائے
اس کو مکا ، اس کو چانٹا
اس کے جھونٹے پکڑے، ڈانٹا
بوڑھا پاس گیا بوڑھیا کے، جوڑ کے دونوں ہاتھ یہ پوچھا :
'' خیر ، بڑی سرکار کی ہووے ، اب تو منوا راضی ہے نا؟،،
بوڑھیا سن کر زور سے بگڑی
بڈھے کو ڈپٹا دھتکارا
حکم دیا نوکر چاکر کو
اس کو تم اصطبل میں رکھو
کاٹے جائے بھوسا چارہ

اک دن گزرا ، دو دن گزرے ،
گزرے آخر دو اٹھواڑے
اب کے تو بڈھے پر اس نے اور بھی بڑھ کر پنجے جھاڑے
'' بڈھے تجھ سے کہا جاتا ہے
سن ، جو حکم دیا جاتا ہے
جا ، اب الٹے پاؤں چلا جا
اور مچھلی سے جھک کر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا یوں جھوٹی موٹی نام کی رانی رہنا
میں ہوں گی سچ مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاہوں حکم چلاؤں
سارے میرا کہنا مانیں ،،
بوڑھا سنتے ہی بھونچکا ہوگیا اور دھیرے سے بولا :
'' گھاس کہیں تو کھا گئی ، جورو ؟
میں جانوں سٹھیا گئی ، جورو ؟
اٹھنا آئے، نہ بیٹھا جائے
منھ کھولے تو بول نہ پائے
لال لگام اور بوڑھی گھوڑی، تجھ پر سارا راج ہنسے گا ،،
دل میں چبھا بوڑھیا کے کانٹا
بڈھے کے منھ پر اک چانٹا
دے کر بولی '' کیا بکتا ہے ؟
ہوش ٹھکانے کر دوں گی میں
افوہ ! تیری اتنی ہمت !
بول بڑا، سرکار کے آگے
اٹھ کر جیبھ کتر دوں گی میں
جا ، عزت کے ساتھ چلا جا
سن جو حکم دیا جاتا ہے
اور جو کی کچھ چیں چپٹ تو
باندھ کے لے جائیں گے تجھ کو
اس میں میرا کیا جاتا ہے ! ،،

بوڑھا دونوں کان دبائے
پھر نیلے ساگر پر پہنچا
لہروں نے وہ پلٹے کھائے
ہوگیا سارا پانی کالا
بوڑھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
'' کیوں بابا ، کیا چاہیے تم کو ؟ ،،
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے :
'' رحم کرو سرکار مری تم
جان کو آئی کھوسٹ بوڑھیا
اس نے اور مچایا اودھم ، اور ہوئی آفت کی پڑیا
دیکھو تو، اب کہتی کیا ہے
اونچے گھر میں خاک دھرا ہے
نام بڑا اور درشن تھوڑے
میں ہوں‌گی سچ‌مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاہوں حکم چلاؤں
سارے میرا کہنا مانیں ،،
مچھلی بولی : '' اچھا بابا
یوں ہی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ
بوڑھیا کو مہارانی پاؤ ،،

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
دیکھتا کیا ہے :
آگے شاہی محل کھڑا ہے
اور محل میں اس کی بڑی بی
سر پر تاج لگائے بیٹھی

سامنے دسترخوان سجا ہے
دائیں بائیں ہیں درباری
پنج ہزاری، ہفت ہزاری
بانکے ٹیڑھے، پگڑی‌والے
مونچھوں‌والے، داڑھی‌والے
سب اس کی سیوا میں لگے ہیں
جام میں مدرا ڈھال رہے ہیں
سات سمندر پار کے تحفے
شکر پارے رنگ‌برنگے
بوڑھیا بیٹھی ٹونگ رہی ہے
چو طرفہ ہے گارد پہرا
برچھے اور کلھاڑے تولے
کس کی ہمت جو کچھ بولے
بوڑھا دیکھ کے ٹھٹکا، سہما
بوڑھیا کے چرنوں میں جھک کر
بس اتنا پوچھا رک‌رک کر :
" رعب بہت گانٹھا مہارانی، پر جو پوچھوں، سچ‌سچ کہنا
اب تو کلیجے میں ٹھنڈک ہے؟ اب تو منواراضی ہے نا ؟ "
سنتے ہی یوں تنکی بوڑھیا
مڑ کر اس کی اور نہ دیکھا
حکم کیا آنکھوں آنکھوں میں
اس کو دھکے دے کے نکالو
آئی بلا ہے، جلدی ٹالو !
ایک اشارہ سا پاتے ہی
لپکے مسٹنڈے درباری
جھٹ سے بڈھے کو جا پکڑا
گدی پر دو ہاتھ جمائے
دھکے دیتے باہر لائے
اور ڈیوڑھی پر لپ جھپ دوڑے چوکی‌والے، گاردوالے
کوئی کلھاڑا تھامے نکلا، کوئی تانے بلم بھالے
بوڑھے کی تو جان کے لالے،

اور اوپر سے ہنسنے والے
جملے پھینکیں، طعنے ماریں :
کوئی کہے، سٹھیایا بڈھا
کوئی کہے، دیہاتی گڈا
کام کیا تھا سر کٹنے کا
جان بچی تو چھوٹا سستا
اب آگے کو آنکھیں ہو گئیں
دیکھ کے چلیو اپنا رستا

پھر جیسے تیسے دن گزرے
اک دن گزرا ، دو دن گزرے ،
گزرے آخر دو اٹھواڑے
اور بھی کچھ سٹھیائی بوڑھیا
اور کھلی آفت کی پڑیا
حکم ہوا ، بوڑھے کو لاؤ
چار طرف ڈگی پٹوا دی
بوڑھے کی ڈھنڈیا مچوا دی
جال کنووں تک میں ڈلوائے
آخر اس کو لے کر آئے
بوڑھیا خوب اکڑ کر بولی : ''سنتا ہے رے بڈھے مچھوے
الٹے پاؤں چلا جا اور جھک کر کہیو مچھلی سے مچھوے :
میں رانی بن کر بھر پائی
راج سنگھا سن سے اکتائی
بس اب تو یہ جی میں سمائی
راج کروں نیلے ساگر پر
قبضے میں ہوں سات سمندر
بیچوں بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
وہ جو ہے سونے کی مچھلی، میری خدمتگار رہے وہ
جیسے چاہوں حکم کروں میں، آٹھ پہر تیار رہے وہ''

سنتا تھا وہ سانس کو روکے
کیا ہمت جو بیچ میں ٹوکے
وہ تو مہارانی تھی اور یہ
اک بڈھا مچھوا بیچارہ
حکم مہارانی کا سن کر
مچھوا ہوگیا نو دو گیارہ
سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھتا کیا ہے : کالی لہریں
طوفانی غصیالی لہریں
زور کے شراٹے بھرتی ہیں
بپھری ہیں، فوں‌فاں کرتی ہیں
بڈھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
"کیوں بابا ، کیا چاہیے تم کو؟"
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے :
"رحم کرو سرکار مری تم ، ناک میں دم ہے مچھلی رانی!
اب کم بختی ماری جورو نے دل میں کچھ اور ہی ٹھانی
کہتی کیا ہے :
میں رانی بن کر بھر پائی
بس اب تو یہ جی میں سمائی
راج کروں نیلے ساگر پر
قبضے میں ہوں سات سمندر
بیچوں‌بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
اور پیاری سونے کی مچھلی، اس کی خدمتگار رہے تو
جیسے چاہے حکم کرے وہ ، آٹھ پہر تیار رہے تو"
مچھلی پٹ پٹ آنکھیں کھولے
سنتی رہی سب کچھ ، بن بولے

پانی پر دم چھپ سے ماری
ساگر کو چپچاپ سدھاری
دیر تلک امید میں بڈھا
ساگر کے تٹ پر ہی ٹھیرا
جب نہ پتہ کچھ اس کا پایا
منھ لٹکائے گھر کو آیا
دیکھا کیا : آنکھوں کے آگے ایک پرانی سی کٹیا ہے
اور اس کٹیا کی چوکھٹ پر بیٹھی وہ کھوسٹ بوڑھیا ہے
ٹوٹا پھوٹا اس کے آگے ایک وھی تسلا رکھا ہے

۱۸۳۳ء

سونے کا مُرغا

سات اقلیم پار دور کہیں
اس جگہ جس کا اور چھور نہیں
ایک دادون نام کا راجہ
ہر طرف رعب‌داب کا باجہ !
نوجوانی میں ایسے ٹھونکے خم
پاس والوں کا ناک میں تھا دم
پر بڑھاپا ، بری بلا ، آیا
خود وہ لشکرکشی سے اکتایا
جی میں آئی کہ کیجئے آرام
کچھ جو ہلکے ہوں راج پاٹ کے کام
تھے پڑوسی بھی تاک میں اس کی
وہ جو رہتے تھے دھاک میں اس کی
اب بوڑھاپے میں سرپہ چڑھنے لگے
موقع پایا تو حد سے بڑھنے لگے
سرحدیں دور دور تک پھیلی
تھیں، تو کرنے کو ان کی نگرانی
اک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی-
رات بھر جاگتے سپہ‌سالار
پھربھی پڑتا تھا دشمنوں کا وار
یوں بھی ہوتا کہ ان کو دشمن سے
ہے تو حملے کا خوف دکھن سے
اور وہ پورب میں آپڑا دن سے
اس طرف سے ہٹاؤ تو بدذات
پھر سمندر سے بڑھ کے کرتے گھات
راجہ دادون مارے غصے کے
ایسا لاچار ہو کہ رو دے
اور جو چاہے کہ آنکھ لگ‌جاتی ،
ایسی ہلچل میں نیند کیا آتی!

آخر اک جیوتشی کو بلوایا
کوئی ہرکارہ اس نے دوڑایا
اور مانگی مدد کہ راج گورو
کچھ بتا ، ہے بڑا گیانی تو ،
اس گیانی نے، مرد دانا نے
تار بجتے ہی راگ پہچانے
ساتھ لایا تھا اپنے اک تھیلا
اس سے مرغا نکالا سونے کا
اور بولا ’’ حضور یہ لیجئے!
تیلیوں پر اسے بٹھا دیجئے!
ہے تو سونے کا جانور لیکن
پہرہداری کرےگا رات اور دن
ہے اگر شانتی تو یہ مرغا
چونچ پر میں دبا کے بیٹھےگا
پر کسی سمت سے ہوئی گڑبڑ
دشمنوں نے کہیں جو کی تڑپھڑ
ہو اچانک اگر کبھی دھاوا
یا کوئی اور آپڑے بپتا
میرا مرغا پلک جھپکتے ہی
چونک اٹھےگا ، اٹھائےگا کلغی
بانگ دے دے کے پھڑپھڑائےگا
اس طرف جھٹ سے گھوم جائےگا ،،
سن کے ترکیب خوش ہوا راجہ
’’ جیوتشی ، تونے کے بڑی کرپا
تجھ کو سونے میں لاددوں تو سہی
آج کی بات عمر بھر کو رہی
پہلے جو مانگے تو ، وہ تیرا ہے
ٹل نہیں سکتا حکم میرا ہے ،،

مرغ بیٹھا جو اونچے اڈے پر
خوب رکھنے لگا حدوں پہ نظر

کھڑکے پتہ، جو ہو زرا آہٹ
جیسے اٹھتا ہے سنتری جھٹ پٹ
یونہی مرغا بھی پھٹپھٹانے لگے
گھوم کر اس طرف بتانے لگے
سر اٹھا کر پکارے "ککڑوں کوں،
چین سے راج کر، میں پہرہ دوں"
تب پڑوسی بھی پڑ گئے ٹھنڈے
کون اٹھاتا لڑائی کے جھنڈے
ہر طرف سے لگائی ایسی چوٹ
پٹ گئی دشمنوں کی ایک اک گوٹ

اک برس گزرا، دوسرا گزرا
چونچ ڈالے کھڑا رہا مرغا
(عیش کی راتیں، امن چین کے دن
چھوٹے ہوتے ہیں، کہہ گئے پوشکن)
ایک دم ایسی ہاہاکار مچی
اٹھ گئے ہڑبڑا کے چھترپتی
سینانایک پکار کر بولا:
"راجہ، مالک ہمارے، ان داتا
اٹھ، مصیبت سروں پہ آئی ہے
تیری پرجاپتی دھائی ہے"
راجہ دادون نے جماھی لی —
پوچھا: "کیا ہے رے، ایسی کیا بیتی؟"
بولا سیناپتی "غضب، سرکار
مرغ سونے کا کررہا ہے پکار
راجدھانی میں غل غپاڑا ہے
بھیڑ بکری کا جیسے باڑا ہے"
جاکے کھڑکی کے پاس دیکھا تو
کوئی دورہ پڑا تھا مرغے کو
مارتا پر، کبھی اٹھاتا موں
کرکے پورب کی اور ککڑوں کوں

پھر تو راجہ نے دیکھا آؤ نہ تاؤ :
'' ہاں ، جوانو سوار ہوجاؤ !
دیر کیا ہے سنبھال لو گھوڑے
ہاں بڑھالو ، نکال لو گھوڑے،،
عمر میں جو بڑا تھا راجکمار
وہ بنایا گیا سپہ سالار
فوج پورب کے راستے ہولی
مرغ کی بند ہو گئی بولی
راجا پر جانے بھی کمر کھولی

اب سنو آٹھ دن گزرنے پر
جب نہ لشکر کی آئی کوئی خبر
نہ یہ معلوم ، رن پڑے کہ نہیں
جن کو بھیجا تھا وہ لڑے کہ نہیں
تب تو بےچین ہوگیا راجہ
اور ادھر مرغ بانگ دینے لگا
پھر چنا دوسرے رسالے کو
ایک للکار دی، کہا '' جاؤ !،،
چھوٹا بیٹا رسالدار کیا
اور بڑے کی کمک پہ بھیج دیا
مرغ چپ ہوگیا ، رہا چپ چپ
اس طرف کا یہ حال ، پھر گپ‌چپ
پھر اسی طرح آٹھ دن گزرے
اور یہ بھی خبر کے بن گزرے
اب کے راجہ بہت نراس ہوا
لوگ باگوں کو بھی ہراس ہوا
پھر وہ مرغا پکارا ککڑوں کوں
تب تو راجہ نے جی میں ٹھانی یوں
خود ہی پورب کی اور چلتا ہوں
لےلیا تیسرا رسالہ ساتھ
جانے کچھ آئے یا نہ آئے ہاتھ

رات دن فوج منزلیں مارے
چلتے چلتے نڈھال تھے سارے
نہ کہیں رن ملا نہ ھاھاکار
نہ لہو تھا ، نہ لاش کے انبار
سوچے دادون اور دل دھڑکے :
'' ھائیں یہ کیا ! کہاں گئے لڑکے ؟،،
(ڈگمگاتا ، کبھی سنبھلتا جائے
سوچتا جائے اور چلتا جائے)
آٹھواں دن حو بیتنے آیا
اک پہاڑی میں راستہ پایا
اونچے اونچے پہاڑ کا گھیرا
بیچ میں ان کے ریشمی ڈیرا
اور ڈیرے کے گرد کیا دیکھا :
ھوکا عالم ، عجیب سناٹا
تنگ گھاٹی میں سب کی سب پلٹن
یوں پڑی، جیسے کٹ گیا ھو بن
پاس ڈیرے کے جو نظر آیا
وہ سماں اور بھی بھیانک تھا
دونوں بیٹے پڑے تھے ننگے سر
اور تن پر نہ تھا زرہ بکتر
ان کی لاشوں میں تھی گڑی برچھی
ایک نے دوسرے کے گھونپی تھی
گھوڑے دونوں کے سبزہ زار کے پاس
چرتے پھرتے تھے روندی کچلی گھاس
گھاس کیسی ، کہاں کی ھریالی !
تھی لہو کی جگہ جگہ لالی !
راجہ دادون بین کرکرکے
روپڑا '' ھائے رے مرے بچے !
ھائے دشمن نے جال میں پھانسا
میرے شکروں کو دےدیا جھانسا
چل بسے تم تو ، چھوڑکر مجھ کو

اب مری آخری گھڑی جانو!،،
پھر تو سب روئے یوں گلے مل مل
درد سے پھٹ گیا پہاڑ کا دل
گھاٹیوں کے لرز گئے سینے
زور سے آہ کھینچی وادی نے
اتنے میں ایک دم کھلا ڈیرا
جھانکا باہر کو چاند سا چہرا
تھی شماخان کی وہ شہزادی
چھب دکھائی شفق سی پھیلادی
یوں سواگت ادب کے ساتھ کیا
اس کو تکتا ھی رہ گیا راجہ
چار آنکھیں ہوئیں تو تھا گم سم
جیسے سورج کے سامنے گلدم
دیکھ کر ایسا کھوگیا دادون
غم سے آزاد ہو گیا دادون
اور وہ راجہ کےسامنے جھک کر
مسکرانے لگی زرا رک کر
پھر بڑھی اور لے کے ھاتھ میں ھاتھ
لائی ڈیرے میں اس کو اپنے ساتھ
چن دیا اس کے آگے دسترخوان
میز پر اک سے ایک بڑھ کر خوان
کھا چکا تو اسے اٹھایا پھر
اک چھپر کھٹ میں جالٹایا پھر
رنگ‌رلیوں میں رات دن گزرے
اس طرح پورے سات دن گزرے
راجہ دادون ہو گیا لٹو،
چل گیا اس پہ حسن کا جادو
روز ڈیرے میں اک جھمیلا ہو
عیش ہو، دل لگی ہو، میلا ہو

گھر کو اب رخصتی کی بات چلی
پوری پلٹن لئے برات چلی
اور چلیں آگے آگے افواھیں
جتنے منھ اتنی باتیں لوگوں میں
راجدھانی کا تھا جو دروازا
اس پہ لینے پہنچ گئی پرجا
جب براتی بڑھے نگر کی اور
ہر طرف تھا ھڑبچو کا شور
رتھ میں راجہ تھا اور وہ ناری
پیچھے جنتا لگی ہوئی ساری
راجہ دادون نے کیا پرنام
اور پرجا کا جب لیا پرنام
ایک دم بھیڑ میں دکھائی دی
ھاتھ بھر کی سفید سی پگڑی
دور سے جیوتشی نظر آیا
اس کو بگلا بھگت بنا پایا
سر سے پاؤں تلک سفید لباس
دیکھتے ھی بلایا اپنے پاس
کرکے ڈنڈوت خیریت پوچھی :
'' کہیے، اچھے تو ھیں سوامی جی ؟
ھم کو سیوا کی آگیا دیجئے !
جو بھی کچھ حکم ھو بتا دیجئے !،،
گیانی بولا کہ '' سنیے ان داتا
آج بیباق کیجئے کھاتا
میں نے جب خوش کیا تھا، یاد ھے نا ؟
آپ نے کیا کہا تھا ، یاد ھے نا ؟
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ھے
ٹل نہیں سکتا حکم میرا ھے
بس یہی پہلی مانگ ھے میری
جو شماخان کی ھے شہزادی
یہ مجھے بخش دیجئے سرکار !

وہ وچن یاد کیجئے سرکار !،،
مانگ ایسی سنی جو راجہ نے
سن کے ہاتھوں سے اڑ گئے طوطے
،، کیا کہا ؟ ،، اس کو ڈانٹ کر پوچھا
،، گھس گیا ، تجھ میں کوئی بھوت بلا ؟
عقل تو نے کہیں گنوائی کیا ؟
تیرے بھیجے میں یہ سمائی کیا ؟
اپنا وعدہ تو یاد ہے مجھ کو
پر ہر اک بات کی کوئی حد ہو
کیوں بھلا تجھ کو چاہئے لڑکی ؟
(مجھ سے کرتا ہے ایسی گستاخی!)
کیا مجھے جانتا نہیں ، ہوں کون ؟
مہاراجہ ، مہابلی دادون !
مانگنا ہے تو مانگ لے مجھ سے
سونے چاندی کی تھیلیاں بھر کے
کوئی منصب ، کوئی بڑا عہدہ
شاہی اصطبل سے کوئی گھوڑا
اور تو اور، اپنا آدھا راج
تو جو مانگے تو بخش دوں گا آج ،،
جیوتشی بولا ،، جی نہیں سرکار،
میں تو کھائے ہوں بس اسی پہ ادھار
جو شماخان کی ہے شہزادی
آپ سے مانگتا ہے فریادی،،
تھوکا راجہ نے، آگیا غصہ :
،، ہشت ! ایسا کبھی نہیں ہوگا
تجھ کو ملتا بھی تھا تو اب نہ ملے
خیریت ہے اسی میں ، لب نہ ہلے
ہاں خبردار، دیکھتے کیا ہو !
سامنے سے ہٹاؤ بڈھے کو !،،
چاہتا تھا الجھ پڑے گیانی
پر الجھنا ہے ایسی نادانی

بعض اوقات مہنگی پڑتی ہے
(بات کرتے میں ، ہاتھ جڑتی ہے)
راجہ دادون نے اٹھایا گرز
اس کے مستک پہ یوں جمایا گرز
وہ گرا جا کے چاروں شانے چت
نہ رہا سانس ، اور نہ سانس کا ہت
راجدھانی تو ساری کانپ گئی
اور لڑکی ہنسے ، ہاہا ، ہی ہی
جانےوالا گزر گیا جی سے
کوئی مرتا ہے ، اس کی جوتی سے
یوں تو خود بھی دہل گیا راجہ
مسکراکر بہل گیا راجہ
رتھ چلا پورے تام جھام کے ساتھ
شہر میں آئے دھوم دھام کے ساتھ
اتنے میں ایک‌دم ہوئی چھن‌چھن
سب کی آنکھوں کے سامنے فوراً
پر پھلاتا ہوا اڑا مرغا
اڑکے اڈے سے رتھ پہ جا پہنچا
ٹھونگ سر پر لگائی راجہ کے
اور مکٹ پر جمالئے پنجے
جان‌لیوا تھی مرغ کی ہر ٹھونگ
رتھ سے راجہ گرا ، ہوئی ہڑبونگ
اور ہڑبونگ میں وہ شہزادی
گم ہوئی ، دے کے سب کو بربادی
ڈھونڈھنے پر کہیں ملی ہے نہیں
ایسی غائب ہوئی کہ تھی ہی نہیں
من گھڑت ہو تو ہو کہانی میں !
پر نصیحت ہے نوجوانی میں -

۱۸۳۴ء

منظوم ناول

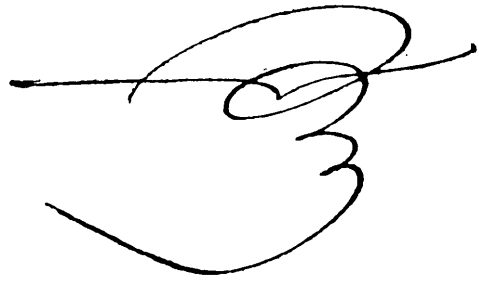

ایوگے نی اَنے گِن
(اقتباس)

دوسرا باب

۲۵ واں بند

تاتیانا تھا بڑی لڑکی کا نام *
حسن میں چھوٹی تھی لیکن شوخ تر
گلبدن ، گالوں پہ سرخی ، شاد کام
تاتیانا پر نہ اٹھتی تھی نظر ۔
سوز میں ڈوبی طبیعت ، کم سخن
وحشی ھرنی کی جھجک ، بیگانہ پن ۔
اتنی چپ‌چپ ، اتنی کم‌آمیز تھی
ھوگئی خود اپنے گھر میں اجنبی
ماںتا کی سدھ ، نہ شفقت کا لحاظ ۔
کھیلنے کے دن تھے ، ھم‌عمروں کے غول

---

* جاگیردار خاندان کے ایک فیشن‌ایبل نوجوان ایوگےنی انے گن کو چچا کی طرف سے بلاوا آتا ھے جو بسترمرگ پر پڑے ھیں ۔ وہ تھوڑے دن بیمار رہ‌کر چل‌بسے اور جاگیر کی وراثت انے گن کو پہنچی ۔ تھوڑے دن گاؤں میں رہ‌کر وہ دیہات کی کھردری زندگی سے اکتا گیا ۔ کچھ دنوں میں جرمن یونیورسٹی کا ایک شاعر مزاج نوجوان لینسکی اس سے ملنے آنے لگا اور دونوں میں تعلقات بڑھتے گئے ۔ لینسکی نزدیک کے ایک قصباتی زمیندار خاندان میں چھوٹی بہن اولگا سے منسوب تھا اور ان کی شادی کی تیاریاں ھورھی تھیں ۔ بڑی بہن تاتیانا زرا سنجیدہ تھی اور ان معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتی تھی ۔ لینسکی نے انے گن کا اس خاندان میں تعارف کرادیا اور وہ بھی کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے آنے جانے لگا ۔

کودتے پھرتے تھے ، کرتے تھے ٹھٹھول
وہ مگر ان سب سے رہتی بےنیاز -
سارے دن اکثر اکیلی ، لب سیے
بیٹھتی کھڑکی کی جانب منھ کیے

— ۲۶ —

جھولنے کی عمر سے ، دن ہو کہ رات
تھے خیال‌وخواب اس کی کائنات -
نرم رو ہے زندگی دیہات کی
سوچنے میں لطف تھا کچھ اور بھی -
جب نہ ہو سینے پرونے کی لگن
انگلیاں کیا جانیں سوئی کی چبھن -
کیا کشیدہ‌کاری، کیا ریشم کے کام
دور سے کرتی تھی ان سب کو سلام -
چیز پر قبضہ جمانے کی امنگ
کھیل میں گڑیوں کے ہے پہلے پہل
رفتہ رفتہ پائےگی دنیا کا رنگ
یوں سکھاتا ہے سماج اپنا عمل
جو سبق ماں سے ملے ، دہرا دیے
حکم ان گڑیوں پہ چلنا چاہیے

— ۲۷ —

تاتیانا کا نہیں گڑیوں میں جی
اب تو کیا ، پہلے نہ کھیلی تھی کبھی -
شہر کی خبریں ہوں یا فیشن کی بات
ذکر تک ان کا سمجھتی واہیات -
تھا لڑکپن چونچلوں نخروں سے پاک
سردیوں کی لمبی راتوں میں مگر
قصے درد انگیز ، ناول خوفناک

پڑھتی جاتی ، دل پہ بھی لیتی اثر
اولگا کے ساتھ والی لڑکیاں
اس کی ماما گھیر لاتی تھی یہاں
تب کشادہ لان میں جمتے پرے
وہ الگ رہتی تھی ان کے کھیل سے
چلبلاہٹ ، کھلکھلاہٹ ، شور غل
بوجھ تھا سینے پہ یہ ہنگامہ کل

— ۲۸ —

شوق نظارہ طلوع صبح کا
بالکونی پر اس کو لےآتا سدا
نور کے تڑکے شفق جب پھولتی
ملگجی چادر افق پر جھواتی
شب کے سازندے اٹھا لیتے بساط
چلتی رخصت ہوکے تاروں کی برات
تب نسیم آتی سویرے کی نقیب
دن کا ڈیرا آلیا بالکل قریب ۔
پھیلی ہوتی جن دنوں جاڑوں کی رات
آدھی دنیا کو اندھیرے میں لیے ،
اور تن آسان مشرق چین سے
پھیکی پھیکی چاندنی میں اونگھتا ،
جاگ اٹھتی ، روز کے معمول پر
اس کی آنکھیں سینکتی شمع سحر

تیسرا باب

مزید بارہ بند کے بعد دوسرا باب تمام ہوتا ہے ۔ دو بن بیاہی لڑکیوں والے خاندان میں دونوں دوستوں کی آمدورفت سے قصبے میں دونوں بہنوں کی شادی کی خبریں اڑتی ہیں ۔ جتنے منھ ، اتنی باتیں ۔

— ۷ —

آخر افواهیں اڑیں ، ان کی بھنک
ہوتے ہوتے اس کے کانوں میں پڑی
لیکن اک مبہم سی درپردہ خوشی
رنگ بکھراتی گئی جیسے دھنک
دل میں اک بےنام اندیشہ پلا
وقت آیا ، ہوگئی وہ مبتلا
خاک میں دانے کا یوں تو کیا شمار
بخشتی ہے زندگی باد بہار
ہورہا تھا کب سے میٹھا میٹھا درد
تھی تصور میں بلا کی تشنگی
یہ بلائے جاں غذا آخر ملی
کب سے تھا پیاسا دل صحرانورد
سینۂ نوخیز اور طوفان شوق
جانے کس کی منتظر تھی جان شوق !

— ۸ —

آنکھ کھولو ، تاتیانا دیکھ لو
سوچتی کیا ہو؟ وہی ہے ، ہو نہ ہو
اب اسی کا دھیان سوتے جاگتے
بس گئی تنہائی اس کی ذات سے
بےزباں ، لیکن طلسماتی وجود
چھا گیا ہر سمت ، ہر شے میں نمود ۔
نوکروں کی فکرمندی ، دیکھ بھال
لاڈ اور دلجوئی بھی جی کا وبال ؛
بوجھ ہے سینے پہ ، گھٹتا ہے دھواں
اب ہے مہمانوں کی آمد ناگوار
ایسی خوش وقتی گزرتی ہے گراں ؛

ان سے کتراتی ہے ، دل میں ہے غبار
جو اچانک آئیں اور جائیں چپک
اٹھتے رہ جائیں نہ اٹھیں دیر تک

اب تاتیانا کا وقت زیادہ تر تنہائی اور ناولوں کے مطالعے میں گزرنے لگتا ہے ۔ وہ چپ چپ رہتی ہے ۔

— ۱۶ —

تاتیانا جذب الفت میں بندھی
بےدلی سے باغ کو جانے لگی
نیچی آنکھیں ، سر جھکائے ، پا بہ گل
جسم بےقابو ہے اور بےکل ہے دل
گرم ہیں رخسار ، آنکھوں میں تپش
ہونٹ سوکھے ہیں ، بہکتی ہے نظر
بج رہے ہیں کان ، سینہ پرخلش
سانس کی رفتار ہے زیروزبر ۔
رات ہوتے ہی فضاؤں کی کشش
دور تک پھیلا گئی نور قمر
اوٹ سے پتوں کی آتی ہے صدا
گا رہا ہے بلبل شیریں نوا ۔
اڑ چکی ہے نیند ، شب کیسے کٹے !
اپنی ماما سے کہا آہستہ سے :

— ۱۷ —

" کیسے سوؤں ہے یہاں اتنی گھٹن
کھول کھڑکی ، بیٹھ جا تو میرے پاس ،
" تاتیانا کیا ہوگیا ؟ "
" میں ہوں اداس

دل بہل جائے ، سنا بیتے بچن ،،
،، کیا بچن، اب کیا سناؤں تانیا ؟
وہ بھی دن تھے جب بہت کچھ یاد تھا
بیتی ان بیتی کہانی انٹ شنٹ
بھولی بھالی کنواریاں ، جن بھوت چنٹ
اب کہاں سوجھے بھلا قصے کا تار
کہنے بیٹھوں ، بھولتی ہوں بار بار
کہنے سننے کی مری باری گئی
گڑبڑا جاتی ہوں ، مت ماری گئی ،،
،، اچھا یوں کر ، آپ بیتی ہی سنا
عشق تھا تجھ کو کسی سے؟ یہ بتا ،،

— ۱۸ —

،، توبہ توبہ ، عشق سے کیا واسطہ
اپنے وقتوں ہم نے دیکھا نا سنا ؛
اور نہیں تو میری وہ مرحومہ ساس
منھ پہ جھاڑو پھیرتی ، کر دیتی ناس ،،
،، کیوں ،، مگر — سہرا بندھا ، شادی جو کی ؟ ،،
،، اس میں کیا ، مالک کی مرضی تھی یہی
عمر میں چھوٹا تھا مجھ سے وانیا ،
میں تھی خود تیرہ برس کی ؛ تانیا !
ہفتے دو ہفتے چلی رشتے کی بات
آخر اک دن نیک ساعت دیکھ کر
دیں دعائیں باپ نے ، چل دی برات
ہول کے مارے بہت روئی — مگر
چوٹیاں کندھے پہ کھولیں ، لے چلے
گیت گائے چرچ میں اچھے بھلے

— ۱۹ —

گھر سے نکلی، دوسرا کنبہ ملا ؛
تانیا ، سنتی ہے میں نے کیا کہا ،،
'' ہائے میری اچھی ماما ، کیا کروں
دل پہ ہے کچھ بوجھ سا ، بیمار ہوں
جی بھرا آتا ہے ، رولوں ، رو ہی لوں ،،
'' میری بچی ، کچھ طبیعت ہے خراب
رکھ اماں میں ، رحم کر پروردگار
دم کیا پانی چھڑک دوں ؟ ہے بخار
منھ سے کہہ ، کیا چاہیے ، سیدھا جواب ،،
'' اچھی ماما ، نا ، نہیں ، بیمار میں
سچ کہوں ، یہ عشق کے آثار ہیں ،،
'' تجھ پہ سایہ رحمتوں کا ، رد بلا ،،
دم کیا اس پر نشاں تثلیث کا
ہاتھ اٹھے کانپتے بہر دعا

— ۲۰ —

'' ہاں مجھے اب عشق کا آزار ہے ،،
اس دکھی نے پھر بڑی بی سے کہا
'' نا ، مری جاں ، تو تو کچھ بیمار ہے ،،
'' یوں سہی ، لیکن مرض ہے عشق کا ،،
چاند اتنے میں نکل آیا یہاں
چاندنی پھیلی تو ابھرا یہ سماں :
تانیا کا حسن پھیکا ، رنگ فق
بال بکھرے ، بھیگے آنکھوں کے ورق ؛
بینچ پر اس مہ لقا کے روبرو
سر پہ اک رومال ، خاکستر سے بال
لمبی صدری میں ڈھکے معذور کھال
چپکی بیٹھی ہے بڑی ہی نیک خو -
جانفزا تھا چاندنی کا فیض عام
بےخبر سوئی ہوئی خلقت تمام

چاندنی کی موج میں یوں بہہ گئی
تاتیانا غور کرتی رہ گئی
اک انوکھی بات سوجھی ناگہاں :
'' اچھی ماما ، دے ذرا کاغذ قلم
چھوڑ دے کچھ دیر کو تنہا یہاں
میز ادھر سرکا ، ادھر اپنے قدم
میں ابھی لیٹوں‌گی تھوڑی دیر بعد ،،
چاندنی ہے ، وہ ہے اور خاموش یاد
ٹیک کر کہنی لیا کاغذ سنبھال
ذہن پر طاری انے گن کا خیال
خط لکھا بن سوچے سمجھے یک بیک
بس گئی معصوم الفت کی مہک
خط لپیٹا ، ہوگیا مضموں تمام
تاتیانا ، یہ بھی سوچا ، کس کے نام ؟

پوشکن نے یہاں دس بند اور تحریر کئے ہیں اور بتایا ہے کہ سادہ دل لڑکیاں جذبۂ دل سے مجبور ہوکر خط لکھنے میں پہل کر بیٹھتی ہیں اور پھر قصوروار ٹھیرتی ہیں ۔
شاعر کا بیان ہے کہ خط فرانسیسی زبان میں نفاست سے لکھا گیا تھا جس کی نزاکت اور معصومیت تو برقرار نہیں رہ سکتی ، البتہ اس کا ترجمہ پیش کئے دیتا ہوں ۔

تاتیانا کا خط انے گن کے نام

میں ہی یہ خط لکھ رہی ہوں آپ کو
اس سے زیادہ اور کیا تحریر ہو ؟
مجھ کو ہے تسلیم یہ اپنی خطا

آپ نظروں سے گرادیں، کیا پتہ!
لیکن اتنا ہے کہ مجھ بدبخت پر
دل میں آجائے جو تھوڑا سا ترس
تب نہ ہوگا مجھ کو رسوائی کا ڈر -
کچھ دنوں کرتی رہی میں پیش‌وپس
شرم سے رہتی بظاہر بےنیاز
فاش ہوتا آپ پر ہرگز نہ راز
منحصر امید پر تھا انتظار
چاہے ہفتے بھر میں آتے ایک بار
دیکھ لیتی اک جھلک اس گاؤں میں
گفتگو سنتی زبانی آپ کی
خود بھی کہتی ''مہربانی آپ کی،،
شوق ہوتا : وہ کہیں اور ہم سنیں -
رات دن ملنے کا رہتا اشتیاق
پھر نہ دوری بھی گزرتی اتنی شاق
پر یہ سنتی ہوں کہ ہیں خلوت گزیں
آپ کا گاؤں میں جی لگتا نہیں
اور ہم ... بےامتیازوکم سواد
بےتکلف مل کے ہو جاتے ہیں شاد

کیوں ہمارے گاؤں میں رکھا قدم
یہ بچارا ، دور افتادہ سا گاؤں
گر یہاں پر آپ کی پڑتی نہ چھاؤں
دیکھتی یہ دن ، نہ سہتی یہ ستم!
ڈھونڈھ لیتیں روح کی بےچینیاں
جس سے بھی سنجوگ ہوتا (کیا خبر !)
اس کو ملتی زندگی میں ہمسفر
باوفا — اور نیک دل ہمدرد ماں

اور کوئی ؟ .. جی نہیں، ایسا کوئی
دل جسے دوں عالم موجود میں

دخل کیا ہے مرضی معبود میں
تھی مشیت ، میں تمھاری ہو چکی
زندگی پائی تھی اس دن کےلئے
تم ملو اور یہ امانت سونپ دوں
ہو خدا کی دین ، تم میرے لئے
سرپہ یہ سایہ رہے، جب تک جیوں۔
دیکھتی تھی پہلے خوابوں میں جھلک
اتنے ہی دلکش ہو تب سے آج تک
وہ نظر ڈالی کہ دل تھرا گیا
مدتوں تک روح میں گونجی صدا
کس طرح مانوں کہ یہ سب خواب تھا !
آئے تم اور دیکھتے ہی دیکھتے
تن‌بدن جلنے لگا ، ہوش اڑ گئے
میں نے سوچا : ہیں وہی ، پہچان لے۔
سچ بتانا ، کیا تمھی تھے ہمکلام
میری تنہائی میں اکثر صبح‌وشام ؟
جب غریبوں کی مدد کی ہے کبھی
یا عبادت میں مجھے راحت ملی
کیا شریک جاں یہی آواز تھی ؟
سچ بتانا ، کون ہے ؟ گر تم نہیں
جو ابھی شفاف اندھیرے میں یہیں
ایک اڑتی سی جھلک دکھلا گیا ،
اور سرھانے برق سا لہرا گیا ؟
تم نہیں تو کون جس نے پیار کے
ہمت افزا بول کانوں میں کہے ؟
تم ہو رحمت کا فرشتہ یا کوئی
ورغلانےوالے چالاک آدمی ؟
مخمصے میں ہوں ، یہ عقدہ کھول‌دو ؛
عمر کچی ، عقل ہے ناقص ابھی
کیا خبر ، سب جھوٹ ہو ، سب وھم ہو ۔
فیصلہ تقدیر کا ہے اور کچھ

یوں سہی — کرنا نہیں اب غور کچھ
تم کو میں نے اپنی قسمت سونپ دی
آنکھ میں آنسو ہیں ، کاغذ میں نمی ؛
التجا کرتی ہوں ، تم دینا اماں
یہ بھی سوچو ، میں اکیلی ہوں یہاں
کون سمجھے ، کون پائے میری بات
سوچ کے ہاتھوں نہیں ملتی نجات
ٹوٹنے والا ہے اب تارحیات ۔
اک نگاہ لطف کی ہوں منتظر
تم سے دل کو زندگی مل جائے پھر
یوں نہیں تو قابل نفرت یہ خواب
توڑ دو اک بار ، اٹھ جائے حجاب ۔
ختم — بس ، پھر سے نہیں پڑھنا مجھے
شرم ہے ؛ سن ہوگئی ہوں خوف سے
اس بھروسے میں نے لکھا ہے یہ خط
آپ برتیں گے شرافت ہی — فقط !

تاتیانا نے کہہ سن کر آیا کو راضی کیا اور اس کے پوتے کے ہاتھ یہ خط بھجوا دیا ۔ کئی دن تک خط کا جواب نہ آیا ۔ کئی روز گزرنے پر جب وہ باغیچے میں گھوم رہی تھی وہاں انے گن کی آہٹ پاکر دم بخود رہ گئی ۔

چوتھا باب

— ۱۲ —

دو منٹ تو دیکھتے چپ چپ رہے
پھر انے گن خود ہی آیا سامنے
تاتیانا سے کہا ’’ میں پڑھ چکا

اپ کا خط ، اس سے اب انکار کیا ۔
عشق کا اظہار اور معصومیت
روح کا اقرار اور سچی نیت ۔
آپ کے اخلاص کا مجھ پر اثر
لہر بن کر دل میں اترا ۔ جاگ اٹھے
سوتے احساسات پچھلے دور کے ؛
آپ کی تعریف سے قطع نظر ۔
بے تکلف ہوکے کہہ دوں صاف صاف
اب مری باری ہے ، گستاخی معاف
پہلے سن لیجئے، مجھے کہنا ہے کیا
بعد میں جو فیصلہ ہو آپ کا !

— ۱۳ —

زندگی محدود کرنے کے لئے
شوق ہوتا گھر گرھستی کا اگر ،
یا کہیں منظور ہوتا غیب سے
باپ اور خاوند بننا عمر بھر ،
یا لبھا لیتے کسی لمحے مجھے
خاندانی زندگی کے بام و در ،
مان لیجئے ، تب تو بس اک آپ ہی
منتخب ہوتیں شریک زندگی ۔
بے تصنع کہہ رہا ہوں دوبدو
اب سے پہلے میرا جو آدرش تھا
آپ ہیں اس کا نمونہ ہوبہو
آپ مجموعہ ہیں سب اوصاف کا ۔
غم کے دن بھی کاٹ لیتے ساتھ ہم
خوش نصیبی تھی یہی بس بیش و کم ۔

— ۱۴ —

لیکن آسائش کا منکر ہے ضمیر
خیر سے اٹھا نہیں میرا خمیر ؛

آپ میں سب گن ہیں ، سارے دلنشیں
ان کے میں قابل نہیں، ہرگز نہیں
مان لیجئے ، (سچ کہوں ، ایماں گواہ)
اک اذیت ہوگا رشتے کا نباہ
عشق ہو چاہے کسی شدت کےساتھ
سرد ہوجاؤں‌گا میں عادت کےساتھ
آپ کو یہ شاق ہوگا ، روئیں‌گی ؛
جس قدر منہ آنسوؤں سے دھوئیں‌گی
اور اٹھےگا سرے دل سے غبار
سوچیے تو ہے یہی انجام کار -
سہرے بندھوالیں بہت دن کےلئے
پھر کھلے، ہم نے فقط تنکے لیے -

— ۱۵ —

اس سے بڑھ کر کیا ہے عبرت کا مقام ؟
ایک گھر اور اس میں گھروالی غریب
جس کو ناھنجار شوھر ھو نصیب
غمزدہ ھو اور اکیلی صبح و شام ؟
اس سے بڑھ کر اور کیا افسوسناک
قدرداں شوھر بھی جب بےلطف ھو
(کوستا رھتا ھو خود تقدیر کو)
چڑچڑا ، خاموش ، بددل ، بےتپاک ؛
میں ھوں ایسا ، دیکھ لیجئے یہ قماش
آپ اک بےداغ جان مشتعل
صاف نیت ، ھوشمندو سادہ دل
خط میں کیا تھی آپ کو میری تلاش ؟
آپ جیسی کو خدا نخواستہ
کیا مقدر ہے یہ چٹیل راستہ ؟

خواب ہی پلٹیں، نہ وہ بیتے برس
اب طبیعت کا بدلنا ہے عبث ...
چاہتا ہوں آپ کو، بھائی کی چاہ
بلکہ نازک تر ہے دل سے دل کی راہ۔
سنیے غصہ تھوک کر، اک خاص بات :
لڑکیاں بھی اپنی پچھلی آرزو
یوں بدل لیتی ہیں جیسے رنگ و بو
تازہ دم پودوں میں آئیں سبز پات
موسم گل بخش دے جوش نمو
ہے مشیت میں یہی راز حیات۔
پھر محبت آپ کو ہوگی — مگر ...
اب کے قابو رکھیے اپنے آپ پر ؛
کون سمجھے گا جو یوں پیش آئیں گی
بھولپن میں آپ خود پھنس جائیں گی۔،،

تاتیانا کی آنکھیں بھر آئیں، لب کشائی کیے بغیر وہ سب کچھ سنتی رہی کھل کر سانس لینا دشوار ہو گیا۔ آخر وہ دونوں چپ‌چاپ، کچھ کہے سنے بغیر رخصت ہوئے اور بنگلے کا احاطہ پار کرکے یوں گھروالوں میں آ بیٹھے کہ کسی کو بدگمانی تک نہ ہوئی۔ انے گن نے اس کے بعد سے یہاں آنا جانا ترک کردیا۔

بعد کے تین باب میں واقعات کا ایک تفصیل‌وار سلسلہ بیان ہوا ہے جس میں شاعر نے قصباتی شرفا کی گھریلو زندگی بیان کی ہے، دوستوں کا ذکر کیا ہے اور آگے بتایا ہے کہ اولگا کا منگیتر لینسکی ضد کرکے انے گن کو ایک خاندانی تقریب کی شام وہیں کھینچ لے گیا۔ اور خواہ مخواہ انے گن نے تاتیانا کو نظر انداز کرکے اولگا کے ساتھ بال روم ڈانس شروع کردیا یہاں تک کہ لینسکی بگڑ بیٹھا۔ اور اس نے غصے اور نادانی سے انے گن کو چیلنج کردیا۔ ڈوئل میں شاعر طبع لینسکی مارا گیا اور انے گن اس ماحول سے ایسا اکتایا کہ قصبے کی جاگیر نگراں کے حوالے کرکے خود نکل گیا۔

اس عرصے میں اولگا کی شادی کسی اور سے ہوگئی۔ تاتیانا کو گھروالے ماسکو لےآئے۔ یہاں ایک پختہ عمر کے فوجی عہدہ‌دار سے اس کی شادی کردی گئی۔

یوں آٹھ سال تک ایک دوسرے سے بالکل بےنیاز اور بےخبر رہنے کے بعد ایک شام جب انےگن کسی اونچی محفل میں مدعو تھا، اس کی نظر ذرا فاصلے سے ایک باوقار اور باغ و بہار خاتون پر پڑی جو اسپین کے سفیر سے بات کررہی تھی۔ انےگن نے اپنے ایک ملاقاتی پرنس سے دریافت کیا کہ یہ کون خاتون ہے؟ جواب ملا کہ یہ میری بیوی ہیں اور فلاں جاگیر پر فلاں خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ انےگن نے بتایا کہ تب تو میں ان کا ہمسایہ رہ چکا ہوں اور اس خاندان سے واقف ہوں۔ پرنس نے اپنی بیوی سے اس گمشدہ دوست کا تعارف کرایا تو یہ وہی تاتیانا نکلی — اس بار وہ رسمی بےرخی کے ساتھ پیش آئی۔ انےگن حیران رہ گیا۔

آٹھواں باب

— ۲۰ —

کیا یہ سچ‌مچ تاتیانا ہے وہی؟
جس نے تنہائی میں، ہلکی چھاؤں میں
دورافتادہ بہنگم گاؤں میں
نیک سیرت کی نصیحت پائی تھی؟
جب انےگن پر تھا نیکی کا جلال
رد کیا تھا کس طرح اس کا سوال!
کیا اسی لڑکی کی وہ تحریر ہے؟
خط میں جس نے رکھ دیا تھا اپنا دل
بےتکلف، صاف، بےپروا، سجل۔
خواب یا یہ خواب کی تعبیر ہے؟
کیا وہی لڑکی ہے جس کو رعب سے
دے چکا ہے ناصحانہ مشورے؟

اور اب وہ بات کرتے وقت بھی
اتنی روکھی ، اس قدر بیباک تھی ؟

— ۲۸ —

ہو چکی ہے تاتیانا اور کچھ
زندگی کے ساتھ بدلے طور کچھ
اس بلندی پر سنبھلنا آگیا !
کیسے ان سانچوں میں ڈھلنا آگیا !
اب اسے پہچاننا ممکن نہیں ؛
یوں نوالی شان سے آیا شباب
طنطنہ ہے محفلوں میں رعب‌داب ؛
اب حیا اور بھولپن کا سن نہیں ۔
وہ کبھی بےتاب تھی اس کےلئے
جب نہ ملتا تھا کسی پہلو قرار
چاند پر جاتی تھیں نظریں باربار
آرزو سینے میں سلگاتی دیے :
ہم بھی اک دن تھام کر ہاتھوں میں ہاتھ
زندگی کی راہ پر نکلیں‌گے ساتھ

انے گن کو سخت پشیمانی ہے اور چاہتا ہے کہ پھر اس سے ربط پیدا کرے ۔ تنہائی کی ملاقات کےلئے بےتاب ہوکر بالاخر اسے خط لکھتا ہے :

'' جانتا ہوں ، جو بھی ہونا ہے اثر
اس بیان درد دل کا آپ پر ،
آپ ڈالیں‌گی حقارت کی نظر ۔
کیا غرض ہے ؟ کیوں بتاؤں اپنا راز
مجھ کو اب کیا چاہیے ، بندہ نواز ؟

ہاں مگر اک کینہ‌پرور گدگدی
دل میں ہو، تحریر یہ پڑھ کر مری!

آپ سے ملنا، وہ حسن اتفاق
جب توجہ میں نے پائی خاص کر
جی نہ مانا، تھام لوں اڑتے شرر
پھر وہی ہو جس کا عادی ہے مذاق۔
تھی جو آزادی کی ٹوٹی سی کمند
اس کا کھونا بھی نہ تھا مجھ کو پسند
بن گئی اک اور بھی وجہ فراق...
لینسکی کا خون اور میں نامراد
اٹھ گیا ہر شوق سے دل اس کے بعد۔
غیر، ہر محفل میں ہوکر بےمحل،
میں نے سوچا: خوش‌نصیبی کا بدل
ہے تو، بس، آزادی فکر و عمل۔
کیسی ٹھوکر کھائی، اے پروردگار!
میں اکیلا اور سزائیں بےشمار!
سب غلط، ہاں آپ کا دیدار ہو
ہمقدم رفتار ہو، گفتار ہو!
شوخ نظریں اور تبسم نیم باز
ہو نگاہ شوق کو ان سے نیاز؛
دل سنے اور آپ فرمایا کریں،
حسن سارا کھنچ کے آئے روح میں؛
دم بخود ہوں، شعلۂ خاموش ہم
عین راحت ہے یہی، عین کرم

اس سے محرومی ہے — لیکن دربدر
پھر رہا ہوں جستجو میں آپ کی
ہر پہر سہنگا ہے، ہر دن قیمتی
زندگی کے دن معین ہیں مگر۔
لٹ رہی ہے عمر اور شوق حصول

حسرتوں کو طول دیتا ہے فضول۔
جانتا ہوں بج چکا میرا گجر
بس یہی مہلت ملی ہے آخری ۔
صبح وعدہ کیجئے دیدار کا
دن چڑھے ہوجائے یہ وعدہ وفا

ڈر رہا ہوں التجا کرتے ہوئے
اس نظر میں، ہے جو اتنی سخت گیر
یہ بھی ٹھیرے مکر کا حربہ حقیر ؛
طیش میں طعنے دیے جائیں مجھے۔
یہ بھی ہوتا آپ کو معلوم کاش :
عشق میں جب حد سے بڑھ کر اضطراب
شعلہ بن جائے تو ہے کیسا عذاب !
عقل بہلائے، جگر ہو پاش پاش۔
ہو تمنا یہ کہ زانو گود میں
لے کے ہم آنسو بہائیں، سر دھنیں
آپ کے قدموں میں کر ڈالیں نثار
التجائیں، لغزشیں، دل کا غبار
اور یہ مجبوری کی ظاہر داریاں !
اوپری مسکان، قابو میں زباں
برتی جائے ہر طرح کی احتیاط
چشم و ابرو میں رہے رسمی سی بات

خیر، جو ہونا ہے ہو، ناچیز میں
خود سے لڑنے کا نہیں اب حوصلہ
مجھ کو ہے منظور، جو بھی حکم دیں
فیصلہ کیجئے مری تقدیر کا۔،،

— ۳۳ —

ایک خط، پھر دوسرا، پھر تیسرا
اس طرف سے کچھ جواب خط نہیں ؛

تھی کہیں محفل ، قدم رکھا ہی تھا
ہو گیا اس سنگدل کا سامنا
بات ہی کرتی، مگر فرصت نہیں ۔
بےرخی اتنی کہ آنکھیں ہوں نہ چار
بےمروت ، سرد ، روکھی ، باوقار
کس قدر سختی سے لب بھینچے ہوئے
ضد میں اپنے آپ کو کھینچے ہوئے
غور سے ڈالی انے گن نے نظر
ہے کہاں وہ سوز ، وہ درد جگر ؟
ہیں نشان عشق یا کچھ بھی نہیں ؟
رخ پہ اشکوں کا پتہ کچھ بھی نہیں
بگڑے تیور کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

اس کے بعد آٹھ بند میں پوشکن نے انے گن کی ذھنی پریشانی کے سلسلے میں بعض مصنفین کا ذکر کیا ہے ۔ ایک روز وہ جی میں ٹھان کر ایسے وقت تاتیانا سے ملنے چلا جب وہ اپنی کوٹھی میں تنہا ہو ۔ ایک الگ تھلگ کمرے میں تاتیانا آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی تھی اور کوئی خط سامنے پڑا تھا ۔ انے گن دوڑ کر اس کے قدموں میں گر گیا ۔

— ۴۲ —

اس کے قدموں میں انے گن سرنگوں
تک رہی ہے اور نہیں جنبش ذرا ؛
جلتے ہونٹوں پر انے گن کے دھرا
ہاتھ بھی بےحس ہے ، خود بھی جوں کی توں ...
کونسی ہے بات باقی، ان کہی؟
دیر تک کیا سوچ کر وہ چپ رہی ؟
یوں کیا آہستہ سے آخر خطاب
" بس بہت کافی ہے ، اب اٹھیے جناب
صاف کہہ دوں آپ سے لب لباب :
کیوں انے گن یاد ہے وہ وقت بھی

باغ میں جب مجھ کو قسمت لائی تھی ؟
آپ اور اندیشۂ دورودراز !
تب سنا تھا میں نے خاموشی سے وعظ
اب مری باری ہے، رکھیےگا لحاظ !

— ۴۳ —

عمر بھی کچھ کم تھی میری، کیا عجب
اب سے تو بہتر رہی ہوں‌گی میں تب ؛
آپ سے الفت بھی تھی ، یادش بخیر !
کی جو میں نے آپ کے باطن کی سیر
کیا ملا ؟ بس ایک روکھا سا جواب !
مجھ سے پہلے بھولی بھالی لڑکیاں
دے چکی تھیں اپنا دل — کہیے کہ ہاں ۔
یا الٰہی — اب یہ کیسا انقلاب !
خون جمتا ہے اگر آجائے یاد
وہ کڑی نظریں ، نصیحت نامراد ۔
مانتی ہوں بےگناہی آپ کی
اس گھڑی برتی شرافت واقعی !
ایسے نازک وقت میں جو کچھ کیا
تھا وہ برحق ، دل سے اس کا شکریہ !

— ۴۴ —

کیا یہ سچ ہے ، اجڑی نگری میں وہاں
شہر کی رونق سے، ہنگاموں سے دور
آپ نے سمجھا تھا مجھ کو بےشعور ؟
آجکل ہیں اس قدرکیوں مہرباں ؟
یہ تعاقب ، یہ توجہ ، کیا ضرور ؟
اب یہاں ہے اونچے لوگوں میں مقام
حیثیت ، اسباب دنیا ، تام جھام

میرے شوہر کر چکے ہیں معرکے
ہم چہیتے ہیں بڑے دربار کے
کیوں اسی پر آپ بھی ریجھے ہیں کیا ؟
ہر طرف چرچے ہوں ، ڈوبے میرا نام
کیا یہی ہے آپ کا بھی مدعا ؟
میری رسوائی ہو ، شہرت آپ کی ؟
کھوؤں میں ، بڑھ جائے عزت آپ کی ؟

— ۴۵ —

اشک امڈے آرہے ہیں ... کیا کروں !
اب بھی اپنی تانیا گر یاد ہو
تو ذرا کچھ سوچیے اس فرق کو :
آپ کے یہ خط ، یہ آنسو ، یہ جنوں
ان سے بہتر تھا وہ ارمانوں کا خوں
وہ کچوکے ، آپ کے جملوں کی دھار
میرا بس چلتا تو کرتی ان سے پیار
نوجوانی میں جو کی تھی کلپنا
وہ بھی ناسمجھی کا تھا پاگل پنا
آپ نے کھایا ترس ، عزت تو کی !
اور اب کیوں آئے ہیں قدموں میں ؟ جی ؟
کتنی چھوٹی بات ہے ، کیسے جچی ؟
آپ جیسا اہل دل اور ہوشمند ،
کیسے کرلی ناز برداری پسند ؟

— ۴۶ —

اور انے گن ، سچ کہوں ، یہ ٹیم ٹام
اس نکمی زندگی کا جھول ہے ،
محفلوں کی گردشیں ، رتبے ، مقام
گھر کی آرائش ، شبوں کے اہتمام

ان میں کیا رکھا ہے ، خالی ڈھول ہے
چیتھڑے ، بہروپ ، سارا طمطراق
رونقیں ، شوروشغب ، کالک کے طاق
آج دے ڈالوں خوشی سے کوئی لے -
گاؤں کا وہ گھر ، کتابیں خوش تمیز
بےتکا باغیچہ ، وہ ایک ایک چیز
وہ ٹھکانے ان سے تو اچھے ہی تھے
جن میں پہلی بار ہم دونوں ملے
سونا قبرستان ، وہ سائے ، صلیب
جس میں سوتی ہے مری آیا غریب-

— ۴۷ —

تب خوشی ممکن بھی تھی نزدیک بھی
لیکن اب تقدیر فیصل ہو چکی
میں نے شاید کی نہیں کچھ احتیاط
اور پھر اماں کی بھی رکھنی تھی بات
منتیں کیں، مجھ کو سمجھایا بہت
آنسوؤں نے ان کے رلوایا بہت
یوں ، بچاری تانیا کرتی بھی کیا
جو بھی ہوتا فیصلہ، منظور تھا
میری شادی ہو چکی — دنیا ہے اور
آپ سے اک عرض ہے ، سنیے بغور !
مجھ سے کوئی واسطہ رکھیے نہ آس
رکھیے اپنی آن کا ، عزت کا پاس
آپ سے الفت سہی ، میں ہوں مگر
جس سے بندھن ہے ، اسی کی عمر بھر-،،

اتنا کہا اور اٹھ کر چل دی - ایوگےنی انےگن بےبسی کے ساتھ وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا - تھوڑی دیر بعد شوہر کے فوجی بوٹوں کی آہٹ ہوئی - پوشکن یہاں اپنے پڑھنےوالوں سے یہ کہہ کر ، سعدی کے ایک

شعر کا حوالہ دے کر رخصت ہوتا ہے کہ :

خوش قسمت ہیں وہ لوگ ، جو زندگی کی بھری بزم سے، اپنا لبالب جام خالی کیے بغیر ہی رخصت ہو گئے ، جو ناول کا آخری ورق الٹنے سے پہلے یوں سدھار گئے جس طرح میں اب اپنے گن سے رخصت ہوتا ہوں ۔

۱۸۳۰ ء — ۱۸۲۳ ء

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱
ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard,
Moscow, USSR